علم پروری و ہنر شناسی

کتاب خانہ نورس (کاپی بک شاپ) کمبر سٹریٹ - اردو بازار - لاہور

علم پروری و ہنر شناسی

از

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

سنہ ۱۹۵۷ء

کتاب خانہ نورس (کاپی بک شاپ) کبیر سٹریٹ اردو بازار
لاہور

مقدمہ

یہاں یہ شائع کردہ مقالہ بعنوان "علم پروری و ہنر شناسی" دراصل روزنامہ "امروز" لاہور کے ۱۹۵۵ء کے استقلال نمبر میں اور اس کے بعد کئی قسطوں میں بعنوان "ہنروری، ہنر شناسی اور ہنر پروری" شائع ہو چکا ہے۔ اس وقت رواروی میں اس کے لکھنے کی بعض علمی احباب کی اچانک وفات محرک ہوئی تھی جس سے ملک کی علمی فضا میں خاصہ خلا پیدا ہو گیا۔ اور صحیح علمی ذوق جو اس ملک میں پہلے ہی عنقا نظر آتا ہے اس میں مزید اضافہ ہوا۔ مرحومین نے نہایت عسرت اور محض جذبۂ خدمت علمی میں زندگی کو وقف کر رکھا تھا۔ ان کے بعد ان کی زندگی کے ایسے حالات اور ان کے پسماندگان کی کس مپرسی کی حالت نے راقم پر خاصہ اثر کیا۔ بلکہ ایک طرح اس آئینہ میں راقم خود اپنا ذاتی مشاہدہ کرنے لگا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہر ذی علم اور جذبۂ خدمت علمی میں دنیاوی جاہ و جلال کے تصور سے بالاتر ہی رہنا ہوگا۔ اور عسرت و افلاس و تہی دستی کا بھی ہمیشہ شکار ہونا پڑے گا۔ سب سے بڑھ کر ان حالات و جذبات میں اپنے گرد و نواح کا شکوہ تک بھی لب پر نہ لانا ہوگا۔ کیونکہ علوم و فنون کا وقار اور بقا بھی اسی جذبہ سے قائم ہے۔ اور علم کی دولت و متاع اس دنیاوی جاہ و جلال کے مقابلہ میں ایک لازوال سعادت ہے۔ چنانچہ ان جذبات کے تحت تاریخ اسلام سے علماء، فضلاء، اور ہنروروں کے چیدہ چیدہ حالات کو جمع کر کے ایک طرح تسلی، سکون، اور حوصلہ حاصل کیا کہ اہل علم کو ہمیشہ ان آزمائشوں سے گذرنا ہوگا۔ اگر وہ ایسا نہیں کرینگے تو علوم ہمیشہ تشنہ رہیں گے۔ چنانچہ اس مختصر مقالہ کو کوئی مسلسل، مبسوط اور مربوط تاریخ تصور نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ راقم نے از سر نو اس تمام مضمون کو ذرا تاریخی ترتیب دے کر تا عہد اورنگ زیب مرتب کر دیا ہے۔ تاکہ علوم پرستی اور ہنر شناسی کا فروغ تاریخ و ثقافت اسلامی میں عہد بعہد پتہ چل جائے اور اپنی اس علمی کاوش کو ان علمی احباب کی یاد میں معنون کرتا ہوں جنہوں نے ان جذبات سے ملک و قوم کی خدمات انجام دے کر رخصت ہوئے۔ اور ان کے اسماء گرامی کے "فرداً فرداً" بیان کا اعادہ بھی ضروری نہیں سمجھتا جب کہ ان کی یاد اور ذکر سے سکون، و سبق و صبر مطلوب ہیں۔ اسی وجہ سے ان کا اخفا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ما توفیقی الا باللہ۔

۳۱ر اگست ۱۹۵۶ء
لاہور

محمد عبداللہ چغتائی

فہرست مطالب

علم پروری و ہنر شناسی

مشرقی علوم و فنون کا فروغ ابتدا ہی سے خلفاء، سلاطین، امراء اور رؤسا کی سرپرستی سے وابستہ رہا ہے۔ عام طور پر ہر مؤلف و مصنف نے اپنی علمی کاوشوں کے مقدمات و تمہیدات وغیرہ میں حمد و ثنا کے بعد اپنے ممدوحین کا ذکر کر کے۔ وجہ تالیف کو واضح کیا ہے۔ بادشاہ وقت کی سرپرستی علوم کا ذکر کر کے سب سے بڑھ کر اپنی کوشش کو ان کے نام معنون کر کے تشکر و امتنان کا اظہار کیا۔

خلفائے بنو امیہ

افسوس کہ بنو امیہؓ کے عہد کے علمی و فنی کارناموں کی تدوین کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں کی گئی ورنہ معلوم ہوتا کہ انہیں کی کوشش سے اہل حرفہ میں تشویق کے ذریعے شام، فلسطین، مصر، تیونس، اندلس و دیگر ممالک جو فتح ہو چکے تھے اسلامی یادگاریں قائم ہوئیں جو آج ابتدائی فن تعمیر اسلامی کی جان شمار ہوتی ہیں اور تاریخ طبری کامل ابن اثیر، فتوح البلدان بلاذری، اخبار الطوال وغیرہ کے مطالعہ سے ہمیں جو کچھ حاصل ہوتا ہے اس سے ہمیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اہل ہنر و علم کو جمع کیا گیا اور ان کی سرپرستی کر کے جو کچھ بھی تعمیر ہوا وہ آج ابتدائی فن تعمیر اسلامی کی جان ہے جس پر آج تک کافی محققانہ تصنیفات یورپین زبانوں میں طبع ہو چکی ہیں۔ اگر اس وقت اس کی طرف توجہ نہ کی جاتی تو یہ عہد بالکل خالی رہتا۔

عبید بن شریہ الجرہمی کی کتاب "الملوک و اخبار الماضین" ایک نادر و نایاب اور اعجوبہ روزگار کتاب ہے جو خاندان امیہ کے پہلے خلیفہ حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان کی اوائل عہد میں سنہ ھ اور

سنہ ۴۳ھ کے مابین تالیف ہوئی۔ یہ عربی و فارسی زبانوں میں مسلّمہ طور پر سب سے پہلی تصنیف ہے اور خلیفہ بنو امیہ کی بے لوث خدمت علمی کا اعتراف کرنا چاہیئے تاکہ لوگ اطمینان سے حظ اُٹھا سکیں۔ حضرت امیر معاویہ نے عبید کی اپنے دربار میں آنے پر بڑی مدارات کیں۔ اس نے اس کتاب میں سلاطین سلف کے واقعات، زبانوں کے اختلافات اور اقوام و قبائل کے افتراق کے اسباب دریافت کئے۔ امیر معاویہؓ آپ اس سے ملوک یمن کے حالات سُنا کرتے۔ عبید نے ایک اور کتاب الامثال بھی لکھی تھی مگر یہ کتاب ناپید ہو گئی۔ اگرچہ ابن ندیم کے بیان سے اس کا ثبوت ملتا ہے کیونکہ اس نے اسے دیکھا تھا۔ کتاب الملوک صدیوں سے لاپتہ تھی مگر اس کے دو مخطوطے برٹش میوزیم اور حیدرآباد دکن کے دائرۃ المعارف میں موجود ہیں۔ آخر اسے حیدرآباد دکن سے نواب عماد الملک کی کوشش سے دائرۃ المعارف نے ۱۹۲۸ء میں پہلی بار شائع کیا۔ غرضیکہ یہ ایک ابتدائی صورت ہُنروری اور ہُنر پروری کی تھی۔ کیونکہ امیر معاویہ کی ہنر شناس نگاہ نے عبید بن شریہ کو ابتدا ہی سے بھانپ لیا تھا کہ یہ کام اس سے ضرور انجام کو پہنچے گا۔

ہشام بن عبدالملک ۱۰۵ھ میں تخت پر متمکن ہوا۔ اس کے عہد میں ملک کے نظم و نسق کی طرف کما حقہٗ توجہ ہوئی۔ یعنی علوم و فنون میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ اس کا میر منشی سالم تھا۔ وہ غیر اسلامی زبانوں کا بھی ماہر تھا۔ اس نے ارسطو کے اُن رسائل کا ترجمہ عربی میں کیا جو سکندر کے نام پر تھے[1]۔ اور اس کے لڑکے نے بہت سی کتابیں فارسی سے عربی میں ترجمہ کیں[2]۔ بقول ابن ندیم سالم کی ترغیب و فیاضی سے اور لوگوں نے بھی بہت سی کتابیں ترجمہ کیں۔ یعنی ہشام کو خود اس کام سے بہت شوق و شغف تھا۔ ایک کتاب نہایت مبسوط تاریخ تھی جس میں تمام شاہان عراق و عجم کی سوانح عمریاں، قواعدِ سلطنت، تعمیرات، علوم و فنون تفصیل سے درج تھے۔ اور ایک خاص بات یہ تھی کہ جس بادشاہ کا حال لکھا اس کی تصویر بھی تھی۔ تصاویر میں حلیہ اور لباس و وضع کو اصلی طور سے دکھایا تھا۔ ہشام نے اس کتاب کے ترجمہ کا حکم دیا۔ ۱۱۳ھ میں یہ ترجمہ تیار ہو کر مرتّب ہوا۔ مؤرخ مسعودی نے لکھا ہے کہ میں نے

---

[1] کتاب الفہرست ابن ندیم ص۱۳۱ [2] ایضاً ص۲۴۴

۳۰۳ھ میں بمقام اصطخر یہ کتاب بصورت ترجمہ مع تصاویر دیکھی۔[1] اس کا خیال ہے کہ یہ تاریخ فارسی کی مفصل اور مبسوط کتاب ہے۔ ہشام نے بیس سال حکومت کے بعد ۱۲۵ھ میں وفات پائی اور ساتھ ہی اُمیّہ کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

خلفائے عباسیہ

اسی طرح خلافتِ عباسیہ کا مرکز بغداد قائم ہوا۔ یہ مقام بقول یاقوت حموی رافدین (دجلہ و فرات) کا اتصال یا ان کے ملانے والا ہے۔ اور اس کی بنا دارالسّلام یا مدینۃ الاسلام کے نام سے خلیفہ منصور نے ۱۴۵ھ میں رکھی۔ جس کی تعمیر میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ جیسے بزرگوں نے بھی حصّہ لیا تھا۔ اور تاریخ اسلام میں یہی ایک زمانہ ہے جس میں علوم و فنون کی تدوین اور تالیف و تصنیف کی طرف بھرپور توجّہ ہوئی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کام حکومت اور پبلک کے تعاون کے بغیر ہرگز ممکن نہ تھا۔ اور اسی زمانہ سے دارالترجمہ کی بنیاد پڑی۔ خلیفہ منصور کی طرف سے خاندان برامکہ کی قدردانی کی گئی۔ خلیفہ منصور کو خالد برمکی کی ذہانت، تجربہ اور اصابت رائے پر کامل یقین تھا جس سے منصور کو اس سے ہر معاملے میں مفید مشورہ حاصل ہوتا تھا۔ آخر اُسے اپنے لڑکے مہدی کا اتالیق مقرر کیا۔ اس کے بعد برامکہ نے وہ جوہر دکھائے کہ تمام عالم میں خلفائے عباسیہ کا ڈنکا بج گیا۔ جس طرح اپنی اعلیٰ خداداد قابلیّت سے خالد مہدی بن منصور کا اتالیق تھا، اسی طرح یحییٰ ابن خالد برمکی بھی ہارون الرشید بن مہدی کا اتالیق تھا۔ جو آگے چل کر خلیفہ عباسی ہوا۔ علماء کے ساتھ خود برامکہ کی فیّاضی کا نقشہ دیکھنا ہو تو صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ صبح کے وقت جیسا کہ الفخری (۱۳۹) میں مذکور ہے خالد کے دروازے پر اہل غرض، شعراء اور شرفاء کا مجمع لگ جاتا تھا۔ جو عرف عام میں "سائل" کہلاتے تھے اور خود خالد اس لفظ کو قبیح و ذلیل سمجھتا تھا بلکہ کہتا تھا کہ ان کے لئے "زوّار" کا لفظ زیادہ موزوں ہے یعنی صحیح اہل ثروت ایسے لفظ کو بھی پسند نہیں کرتے تھے جس سے ان کے فیض و سرپرستی میں سقم پیدا ہوتا ہو جب کہ ان میں اکابر قوم اور اشراف بھی شامل ہوں۔

---

[1] کتاب التنبیہ والاشراف للمسعودی ۳۰۶ھ

غرضیکہ منصور کی ہنر شناسی، ہنر پروری اور ہنر افزائی سے بغداد ضرب المثل ہوگیا اور اسی عہد سے یونانی، سریانی اور سنسکرت و دیگر زبانوں سے تراجم شروع ہو گئے تھے۔ اسی عہد عباسیہ میں مہابھارت کا سنسکرت سے عربی ترجمہ ابوصالح بن شعیب بن جامع نے کیا تھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس طرح علم کی سرپرستی سے بغداد کو بین الملّی مقام ابتدا ہی سے حاصل ہوگیا تھا۔ یحییٰ کے متعلق بقول مولوی عبدالرزاق مؤرخین متفق ہیں کہ اس سے زیادہ کوئی صائب الرائے، بردبار، عالی حوصلہ، خوش اخلاق، شجاع، فصیح و بلیغ، عقیل اور فیاض نہیں ہوا۔ خاص کر علوم و فنون کے ساتھ فیاضی میں تو وہ ضرب المثل ہو چکا تھا۔ کسی نے اسحاق موصلی سے جس نے اس عہد میں عباسیوں کی فیاضیوں سے موسیقی کو کمال تک پہنچایا، یحییٰ کی فیاضی کے متعلق پوچھا، تو اس نے یہ اشعار پڑھے

سالت الندی هل انت حرٌّ فقال لا　　ولکنی عبد لیحیی بن خالد

فقلت شراء قال لا ھل وراثۃً　　توارثنی من والد بعد والد

ترجمہ:۔ (۱) میں نے سخاوت سے پوچھا کہ تو آزاد ہے، اس نے کہا نہیں بلکہ میں یحییٰ بن خالد کی کنیز ہوں۔
(۲) میں نے کہا کیا اسی نے تجھ کو خریدا تھا اس نے کہا نہیں بلکہ باپ دادا سے مجھ کو وراثت میں پایا تھا۔

غرض اسی عہد میں اسلامی علوم و فنون کی نہایت سائنٹفک طریق پر محض ان خلفاء کی سرپرستی اور ہنر پروری کی وجہ سے ہر شعبہ میں ترقی ہوئی اور جو بھی اس عہد میں منصۂ شہود پر آیا وہ امام کی حیثیت سے سامنے آیا تھا اور ان کے کارنامے آج اگر مٹا بھی دئے جائیں تو اُن کے متعلق جو قصے صدیوں سے زبان زد عام و خاص چلے آتے ہیں ان کو کون محو کر سکے گا۔ آخر ان میں کچھ تو حقیقت ہے۔ اسی عہد کی یادگار ہیں عبداللہ ابن مقفع کی کلیلہ دمنہ اور ہارون الرشید کے عہد کی الف لیلہ کے متعلق ایک مرتبہ حسن علی بلگرامی مترجم "تمدّن عرب و تمدّن ہند" نے کہا تھا کہ اگر تمام دنیا کا علم و ادب مٹ بھی جائے تو کلام اللہ، الف لیلہ، اور صحیح بخاری کافی ہیں۔ یعنی ثقافت اسلامی کی یہ صحیح آئینہ دار ہیں۔ جس سے ان کا مرتبہ و مقام واضح ہے۔

علم و ادب میں اصمعی کا مرتبہ مسلّمہ ہے مگر اس کا سہرا ہارون الرشید کے سر ہے۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ وہ عربی لغت کا امام تھا۔ اور وہ اسی زمانہ میں بصرہ سے بغداد آگیا تھا۔ اگر رشید کا اس سے مسادیانہ

لہ البرامکہ

سلوک نہ ہوتا تو وہ تمام کتب جو اُس نے لغت میں چھوڑی ہیں شاید ہی میسر آتیں۔

ابو الفرج اصفہانی (۲۸۴-۳۵۶ھ) کا ذکر ناگزیر ہے جس کی تالیف کتاب الاغانی بیس جلدوں میں ملتی ہے۔ یہ عربوں کی صحیح زندگی یعنی ان کے صحیح شغف، شعروشاعری اور موسیقی سے متعلق ایک مرقع ہے جسے اس نے پچاس سال کی لگاتار محنت و کوشش سے تیار کیا۔ اگر آج یہ کتاب موجود نہ ہو، تو عرب کا علم وادب کا تاریخی سرمایہ ادھورا رہ جائیگا جب ابو الفرج نے یہ تالیف سیف الدولہ بن حمدان کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کی تو اس نے فوراً ایک ہزار سُرخ دینار عطا کر کے معذرت کی۔ صاحب بن عباد (متوفی ۳۸۵ھ) سے حکایت نقل کی جاتی ہے کہ وہ سفر میں ایک مکان سے دوسرے مکان میں جاتے وقت تیس اونٹوں کے بوجھ کی ادبی کتابیں مطالعہ کرنے کے لئے ہمراہ رکھتا تھا۔ جب آغانی اس کے پاس پہنچی تو وہ اس تکلیف سے مستغنی ہوگیا۔ ابو الفرج ہمیشہ وزیر تعلیم کے ہمراہ خاص طور پر رہتا تھا جس کی مدح میں اس نے بہت کچھ کہا ہے۔

سیف الدولہ الحمدانی متوفی ۳۵۶ھ عام طور پر ممدوح متنبی کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہے جس کا دربار ہمیشہ اپنے زمانہ کے بڑے پایہ کے علماء، فضلاء، ادباء کا مرجع تھا۔ اس نے خاص قسم کے دینار علماء و فضلاء کو دینے کے لئے بنوائے تھے جن کو اکثر انعام واکرام بطور ہنر پروری و ہنر افزائی دیا کرتا تھا۔ اسی کے دربار میں پڑھے لکھے حضرات کو ایک خاص قسم کا اطمینان ہوتا تھا۔ فارابی (متوفی ۳۳۹ھ) جیسا محقق اسی پر اکتفا کرتا تھا کہ وہ اس کے دربار سے منسلک ہے اور چار دینار یومیہ محض قوت لایموت کے لئے لے کر قناعت کرتا تھا۔ اسی طرح اس کی سخاوت اور حوصلہ افزائی سے بے شمار فضلاء و ادبائے زمانہ اس کی طرف کھچے آتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک شام میں مقام حلب نے سب سے زیادہ اہمیت حاصل کرلی تھی۔ متنبی (۳۵۴ھ) سے کسی نے پوچھا کہ تم سیف الدولہ کے دربار کو کیوں ترجیح دیتے ہو۔ اس نے مختصراً یہ جواب دیا کہ وہ شعر کو سمجھتا ہے۔

ملوک آل بویہ

سلاطین دیلم کی فہرست میں ایک درخشندہ ستارہ عضد الدولہ دیلمی نہایت اوج پر نظر آتا ہے جو

ذی قعدہ ۳۲۴ھ میں پیدا ہوا اور اس کا انتقال شوال ۳۷۲ھ میں بغداد میں ہوا۔ وہ چودہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اگرچہ مذہباً شیعہ تھا مگر اس کا سلوک اہل سنن اور تشیع سے مساویانہ تھا۔ اور ان کا احترام کرتا تھا۔ ۳۳۸ھ میں وہ فارس کا حکمران قرار پایا۔ جہاں اس نے ۳۶۳ھ تک حکمرانی کی اور اس کے حسن سلوک کا نتیجہ تھا کہ کوئی بغاوت نہیں ہوئی۔ وہ رکن الدّولہ کے انتقال کے بعد ۳۶۶ھ میں عراق پر بھی قابض ہو گیا خلفائے عباسیہ کی کمزوریوں سے جو طوائف الملوکی کا بازار گرم تھا اس نے اپنی حکمت عملی سے اس کا انسداد کیا۔ وہ نہایت عقل مند، فاضل، مدبّر، سیاست دان، صاحب الرائے، فضائل کا فریفتہ، رذائل سے متنفّر، سخی، فیاض، منتظم، بہادر، جری اور بلند حوصلہ بادشاہ تھا۔ سیاست ملک میں جتنا اس کا رُعب و دبدبہ تھا شاید ہی کسی کو میسّر آیا ہو۔ اسے علم و علماء و فضلاء سے بہت محبت و عقیدت تھی اس کے عہد میں اس کی سرپرستی میں بڑی قیمتی اور ضخیم کتب تصنیف ہوئیں۔ جو خود عضدالدّولہ کے نام سے لکھی گئیں اور ان کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس نے علم نجوم اور علم زائچہ کو استاد عبدالرحمٰن بن عمر صوفی جیسے بلند پایہ عالم سے حاصل کیا جس نے عضدالدولہ کے نام پر "الصور السمائیہ" کتاب لکھی۔ ان کا علوم میں یہ پایہ تھا کہ عضدالدّولہ نے بطور ناز اور افتخار عالموں کو خطاب کر کے کہا تھا کہ علم نحو میں میرا استاد ابوعلی فارسی نحوی ہے، اور حل زیچ میں میرا استاد ابن الاعلم ہے اور میرا استاد کواکب ثابتہ اور ان کے مکانوں اور رفتار کے علم میں صوفی (عبدالرحمٰن بن عمر) ہے۔

عضدالدّولہ کی تعمیرات تو بے شمار ہیں مگر ان میں سے مشہد حضرت علیؓ نجف اشرف میں زیادہ مشہور ہے۔ اگرچہ بعض کے نزدیک حضرت علیؓ کا مدفن کوفہ میں ہے اور نجف میں قبر مغیرہ بن شعبہ ثقفیؓ کی ہے۔ اور مشہد امام حسینؓ کربلا میں اس نے قائم کیا۔ جہاں اب ہزاروں زائرین ہر سال پہنچتے ہیں۔ شہر مدینہ کی شہر پناہ، بغداد میں مغربی جانب کے کنارے بیمارستان (ہسپتال)، عضدی کی عمارت اسی کی تعمیر کردہ ہے۔ شیراز میں اس نے کافی محلات قائم کئے۔ غرض کہ عضدالدولہ کو ۳۰ - ۳۵ سال کی مدت جو میسّر آئی اس میں عضدالدولہ کی سرپرستی علوم و فنون میں چاروں طرف نظر آتی ہے۔ جس سے تمام مشرق میں وہ علمی اور فنی کارنامے عضدالدولہ کی وجہ سے ظہور میں آئے اور اب تک ضرب المثل بنے ہوئے ہیں

عضدالدولہ نے شیراز میں ایک عالی شان محل تیار کرایا تھا جس کی نظیر مشرق و مغرب میں نہیں ہے تمام عمارت گنبدوں کا تاج بنی ہوئی تھی اور اسی عمارت میں ایک مہتمم بالشان کتب خانہ قائم کیا تھا۔ جس میں التزام کیا تھا کہ جس قدر کتابیں شروع اسلام سے اس کے عہد تک تصنیف ہو چکی تھیں سب مہیا کی جائیں۔ معاصر مؤرخین نے لکھا ہے کہ ایسی عمارت ممالک اسلامیہ میں نہیں دیکھی گئی۔ اور کوشش یہ تھی کہ کسی طرح یہ تمام عمارت بہشت کے نمونہ پر تعمیر ہو۔ اس کے شیراز کے محل کی عمارت کا وہ حصہ جس میں یہ کتب خانہ ہی تھا ایک نہایت طویل مکان تھا۔ اس میں ہر طرف متعدد کمرے تھے جن میں بے شمار الماریاں دیواروں سے لگی کھڑی تھیں۔ اور تین تین گز چوڑی اور قدِ آدم اونچی تھیں۔ لکڑی عموماً منقش اور منقّب تھی ہر علم و فن کے لئے جدا کمرہ تھا اور اس کی جداگانہ فہرست تھی۔ کتب خانہ کے اہتمام و نگرانی کے لئے وکیل اور خزانچی و محاسب مقرر تھے۔ محض فاضل و علما اور معزز حضرات داخل ہو سکتے تھے[1]۔

عضدالدولہ یہاں تک مقبول خلائق تھا کہ غیر مسلم بھی مساویانہ طریق پر اپنے طریق مسلک میں رہتے تھے اور ان کو پوری آزادی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے وزیر نصر بن ہارون کو چرچ اور گرجاؤں کے بنانے کی عام اجازت تھی۔ چنانچہ اس نے ۳۶۹ھ میں نہایت کثرت سے تمام ممالک اسلامیہ میں چرچ اور گرجے تعمیر کرائے تھے[2]۔

علماء کی بے لوث خدمت

بعض اوقات علما و ادبا و شعرا کی بھی عجیب و غریب شان نظر آئے گی کہ وہ اپنے فرائض تعلیم و تعلّم میں اس قدر سرشار اور منہمک نظر آئیں گے کہ وہ کسی بڑے معاوضے کی تو کیا، بڑی پوزیشن کی بھی پروا نہیں کریں گے۔ اور اپنے کام سے اگر ان کو اطمینان حاصل ہو گیا تو عسرت کی بھی پروا نہیں کریں گے۔ چنانچہ الخلیل بن احمد (متوفی ۱۷۵ھ) جس نے علم العروض ایجاد کیا تھا بلکہ عربی موسیقی کی گتوں کو بھی ایجاد کیا

---

[1] رسائل شبلی ص ۲۸ [2] ابن الاثیر واقعات ص ۳۶۹

تھا۔ اس نے ہمیشہ عسرت میں زندگی بسر کی مگر ہمیشہ بشاش ہی نظر آیا۔ کبھی کسی عہدے کے لئے خواہش نہیں کی۔ اسی طرح ابوالبرکات الانباری (متوفی ۵۷۷ھ) اگرچہ بہت غریب تھا مگر کبھی کسی طالب علم سے کوئی فیس نہیں لی۔ بلکہ مفت تعلیم دے کر خوش ہوتا تھا اور لوگ صحیح عالم کی یہی شان تصور کرتے تھے اسی طرح جب نظام الملک طوسی نے بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم کیا تو ماوراء النہر کے لوگوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں کسی قسم کا معاوضہ نہیں لینا چاہئے۔ کیونکہ ان کے نزدیک علم کا عام چرچا لازمی ہے۔ اس کی ایک اور مثال خطیب بغدادی (۴۶۳ھ) کی بھی ہے۔ خطیب نے وفات سے پیشتر اپنے دو سو دینار محدثین اور قاضیوں کے درمیان تقسیم کر دیئے۔

ابو اسحاق ابراہیم بن محمد اسفراینی لقب رکن الدین (متوفی ۴۱۸ھ) کو علوم میں جو بلند درجہ حاصل تھا اس وجہ سے ان کا عام لقب استاد مشہور تھا۔ فقہ شافعی میں یگانہ روزگار تھے۔ نیشاپور کے تمام مشائخ وصلحا آپ کے شاگرد تھے۔ آپ کا علوم میں پایہ اہل عراق وخراسان بھی مانتے ہیں۔ نیشاپور کا مشہور مدرسہ آپ کے لئے تعمیر ہوا تھا۔ اور امام کا درجہ آپ کو حاصل تھا۔

حافظ ابوالطاہر احمد بن محمد الاصفہانی لقب صدر الدین نے طلب علم حدیث میں دور دراز مقام کا سفر اختیار کیا اور مشائخ سے ملاقاتیں کیں۔ آپ شافعی مذہب کے بہت بڑے پایہ کے عالم تھے۔ مگر لغت خطیب ابوذکریا یحییٰ تبریزی لغوی اور فقہ ابوالحسن علی ہراتی سے حاصل کی اور کافی سیاحت کے بعد آپ اسکندریہ میں مقیم ہوئے۔ آپ کی خدمات علوم کا اعتراف کرتے ہوئے عادل ابوالحسن علی بن سلار ظافر عبیدی مصر کے وزیر نے ۵۴۶ھ میں ثغر اسکندریہ میں آپ کے لئے مدرسہ بنا کر آپ کے سپرد کر دیا۔ جو آج بھی مشہور ہے۔ آپ کا وہیں ۵۷۶ھ میں انتقال ہوا۔

ابو غالب تمام بن غالب بن عمر اللغوی مشہور تبانی۔ آپ قرطبہ کے ضلع مرسیہ کے باشندہ تھے۔ لغت اور فقہ میں امام کا درجہ رکھتے تھے۔ آپ کے علم، دیانت اور پرہیزگاری کے متعلق مشہور ہے اور ابن الفرضی کا بیان ہے کہ امیر ابوالجیش مجاہد عامری نے جب مرسیہ کو مغلوب کیا تو ابو غالب وہیں مقیم تھا۔ ابوالجیش نے آپ کے پاس ایک ہزار دینار ارسال کئے تاکہ اپنی کتاب میں لکھ دیں کہ یہ کتاب ابوالجیش

کے لئے تالیف ہوئی ہے۔ اس نے ہزار دینار کی وہ رقم واپس کر دی اور کہا۔ اگر دنیا بھی میرے لئے بدل جائے تو بھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے یہ کتاب عوام النّاس کے لئے لکھی ہے۔ اس نے اس کتاب کا نام "تلقیح العین" رکھا۔ آپ کا انتقال مقام مرسیہ میں ۵۳۶ھ میں ہوا۔

ابو سعد عبداللہ بن ابی السری تمیمی شرف الدین ان بزرگوں میں سے ہیں جنہوں نے محض علم کو حاصل کرنے اور لوگوں کو اس سے مستفید کرنے میں سخت محنتیں کیں اور یکتائے روزگار ہوئے۔ انہوں نے اکثر مقامات کا سفر کیا۔ بغداد، واسط میں تو خود تعلیم حاصل کی۔ موصل میں درس دیا۔ سنجار میں پڑھایا۔ حلب میں قیام کیا۔ دمشق میں اس وقت جامع اموی میں درس دیتے تھے جب ملک نورالدین محمود بن عمادالدین زنگی نے قبضہ کیا۔ آپ کو اوقافِ مساجد کا متولی بھی کیا گیا، اور بے شمار کتابیں تصانیف چھوڑی ہیں۔ ۵۸۵ھ میں وفات پائی اور آپ کو شہر کے اندرونی حصہ میں اس مدرسہ میں دفن کیا گیا جو آپ نے خود تیار کیا تھا۔

اُندلس میں علوم و فنون کا فروغ

موسیٰ بن نُصیر والی افریقہ کے فوجی سردار طارق بن زیاد نے اندلس کو شوال ۹۲ھ میں فتح کر لیا تھا۔ یہاں اگر ہم ذرا توقف کر کے ابتدائی فتوحات اسلامی کا نقشہ سامنے رکھ کر جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منوّرہ میں قیام سے لے کر اوّل صدی کے اختتام تک ہر دو یورپ و ایشیا کے اکثر حصّہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ خاص کر یورپ کے مغرب اقصٰی میں ان کی فتح اندلس بہت بڑا عظیم الشان کارنامہ تھی۔ مسلمانوں کی سلطنت اندلسی کا خاتمہ آخر نویں صدی ہجری میں ہوا۔ مگر ان کے آثار جو آج بصورت محلات و مساجد وغیرہ کچھ باقی رہے اگرچہ آج اکثر ان میں کھنڈرات ہی ہیں ان کے گرد ثقافت اسلامی کا ماحول صدیوں سے آج بھی جلوہ گر ہے۔ اور تمام یورپ کی انسانی زندگی کے نشو و نما میں اس کا براہ راست اثر آج بہت بڑا عنصر تسلیم کیا جاتا ہے۔

ابتدا ہی سے مغیث الرومی نے طارق بن زیاد کے حکم سے قرطبہ کے شہر پر قبضہ کر لیا تھا اور ۱۱۶ھ میں اسے دارالحکومت قرار دیا تھا۔ بلکہ بعد میں تمام اندلس کی اسلامی حکومت کا دارالحکومت قرار پایا۔ اور یہاں جب امیر عبدالرحمٰن بن معاویہ بن ہشام ۱۳۸ھ میں بادشاہ ہوئے اور ان کی سلطنت کا استحکام ہوگیا تو انہوں نے تعمیرات کی طرف توجہ کر کے عمارات کی بنا ڈالی۔ ساتھ ہی جامع مسجد کو بھی وسیع پیمانے پر بنوانے کا خیال گزرا۔ جس کی بنا اگرچہ ایک قدیم گرجا پر ہوئی۔ یہ مسجد کافی عرصہ میں کئی قسم کی تکالیف و سیاسی مرحلوں سے گذرنے کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچی اور آج اگرچہ پھر گرجا شمار ہوتی ہے مگر پھر بھی اسلامی تعمیر ہونے کی حیثیت سے ضرب المثل ہے۔

اندلس کی مساجد دراصل یونیورسٹیاں تھیں کیونکہ ان کے ساتھ ہی بڑے بڑے پیمانے پر مدارس قائم کئے گئے جن کے لئے دور دراز سے علماء و فضلا بلائے گئے۔ جن کے کارنامہ سے آج تاریخ ثقافت اسلامی اور تاریخ علم و ادب میں بہت اہم باب شمار ہوتے ہیں۔ اور یہ اندلس کی اسلامی درسگاہیں مصر کی یونیورسٹی ازہر اور بغداد کا مدرسہ نظامیہ سے بھی اوّلیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ چنانچہ قرطبہ کے مدارس اور دارالعلوم کے ضمن میں پروفیسر ڈوزی لکھتا ہے کہ "اس شہر میں ہر قسم کے علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ابتدائی مدارس اعلیٰ درجہ کے بکثرت موجود تھے۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ عیسوی یورپ میں سوائے پادریوں یا ایسے لوگوں کے جو حکومت کے بڑے بڑے عہدے رکھتے تھے سب ناخواندہ ہوتے تھے۔ لیکن مسلمانوں میں ہر متنفس لکھا پڑھا ہوتا تھا۔ نحو و معانی و بیان کی تعلیم تمام مدارس میں ہوتی تھی۔ باوجود اس کے خلیفہ الحکم کو اس بات کا یقین تھا کہ تعلیم کی جس قدر اشاعت ہونی چاہیئے وہ نہیں ہے۔ اسی خیال کی وجہ سے انہوں نے ۲۷ مدرسے غریبوں کے بچوں کے لئے کھلوا دئے تھے۔ ان میں مفت تعلیم دی جاتی تھی اور مدرسین کی تنخواہیں خلافت مآب کے صرف خاص سے ادا کی جاتی تھیں۔ قرطبہ کا دارالعلوم دنیا میں سب

سے زیادہ مشہور تھا۔ اساتذہ جامعہ قرطبہ میں بیٹھ کر طلبہ کو پڑھاتے تھے۔ یہاں علامہ ابو بکر بن معاویہ القرشی حدیث کا درس دیتے تھے۔ علامہ ابو علی القالی البغدادی ایام جاہلیت، باشندگان عرب قدیم کے حالات، ان کی زبان، امثال اور شاعری پر خطبے دیتے تھے۔ ان ہی خطبوں کا مجموعہ بعد کو امالی کے نام سے شائع ہوا۔ ابن القوطیہ نحو پڑھاتے تھے اور علامہ القالی ان کی نسبت فرماتے تھے اندلس میں ابن القوطیہ سے بڑھ کر کوئی نحوی نہیں ہے۔ ابو علی القالی کی زندگی میں دوران قیام قرطبہ ایک عجیب و غریب اچانک واقعہ پیش آیا۔ ایک دفعہ بازنطینی سفیر قرطبہ میں تشریف لایا اور خلیفہ الناصر اس کے استقبال و اعزاز میں نہایت شان و شوکت سے پذیرائی کر رہا تھا تو ابو علی القالی اس موقع پر برجستہ حسب معمول تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہوا۔ تو اس پر اتفاقیہ ایسی ہیبت چھا گئی کہ اس سے ابتدائی الفاظ حمد و ثنا کے آگے کلمات منہ سے نکل ہی نہیں سکے۔ یہ حالت دیکھ کر فوراً ان کی جگہ المنذر بن سعید نے برجستہ فی البدیہہ نہایت موزوں خطبہ پیش کیا۔ اس واقعہ کو مقری نے نفح الطیب میں مفصل بیان کیا ہے۔

ابن خلکان (متوفی ۶۸۱ھ) نے اپنی تالیف "وفیات الاعیان" میں ابو الفرج کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ دو بڑے عالم یعنی ابو الفرج اصفہانی اور ابو علی القالی ایک ہی سال ۳۵۶ھ میں فوت ہوئے۔ مؤخر الذکر اپنے معاصرین میں سبقت رکھتا تھا۔ اس نے علوم کو ابن درید ازدی سے حاصل کیا تھا۔ اور کافی سفر بھی کیا تھا۔ دیار بکر میں ۲۸۸ھ میں پیدا ہوا۔ علوم کے حاصل کرنے کی اشتہا میں وہ موصل میں ابو یعلی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور وہاں کچھ عرصہ قیام کر کے علوم حاصل کئے۔ بلاذری نے اپنی کتاب فتوح البلدان میں بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ یونانی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ بہت سے شاہی خاندان کے متعلقین مختلف صوبوں میں متمکن ہو گئے۔ ان میں ایک صوبہ ارمینیہ کہلاتا تھا جسے اس نے بنایا تھا۔ اس کی بیوی نے اس کی وفات کے بعد وہاں سلطنت سنبھالی اور عربوں نے اس کے اپنے نام پر اس مقام کا نام "قالی قالا" رکھا ہے۔

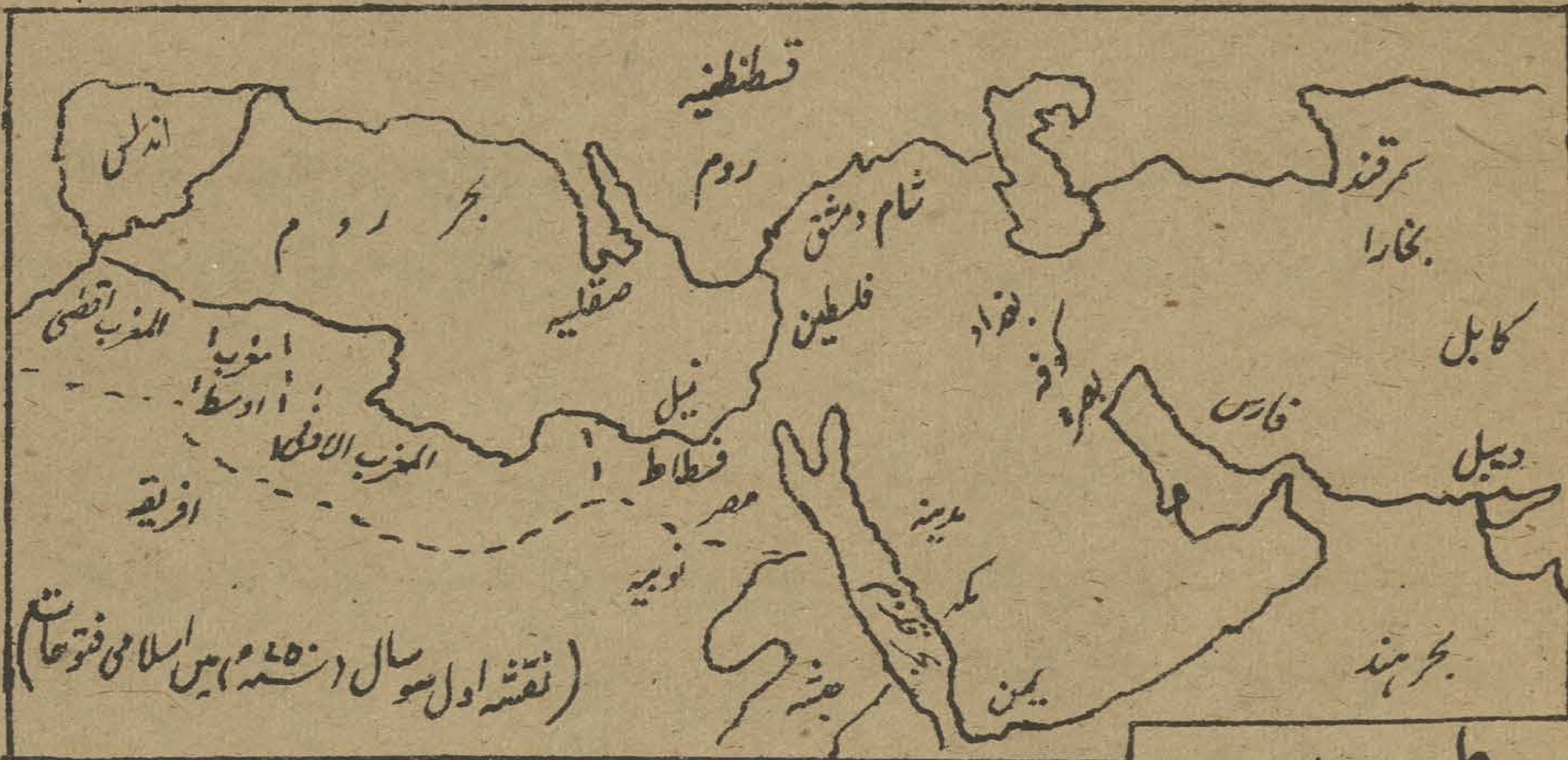
مسلمانوں نے غرناطہ جو زیادہ تر اندلس کے جنوب میں ہی واقع ہے، ابتدا سے ہی مسلمانوں

کی جدو جہد کا بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ جہاں انہوں نے بے شمار عمارتیں قلعہ میں تعمیر کیں جو بنی الاحمر کی طرف منسوب ہے۔ یہ عمارتیں اپنی زیب و زینت کی وجہ سے آج "الحمراء" کے نام ضرب المثل ہو گئی ہیں۔ البتہ یہاں بادشاہ محمدؐ بن الاحمر نے ۶۲۹ھ میں ایک قصر بنوایا جس مقام پر یہ قصر تعمیر ہوا۔ غالباً اسے قدیم زمانہ ہی سے قلعہ الحمرا بھی کہتے تھے۔ ان بادشاہوں میں سے محمدؐ خامس الغنی باللہ نے ۷۵۵ھ سے عنان حکومت سنبھالتے ہی اس قصر کی توسیع کی اور عمارتوں میں طرح طرح کے تکلفات کئے جو دنیا بھر کی تاریخ تعمیرات میں ضرب المثل ہو چکا ہے۔ آخر ۸۹۸ھ سے یہ قصر اور قلعہ عیسائیوں کے قبضہ میں آ گئے۔ اس کی تعمیر سے مسلمانوں نے جس ہنروری اور ہنر شناسی کا ثبوت دیا وہ آج نہایت مستند طور پر ایک خاص طرز اندلسی اسلامی کا لقب اختیار کر چکی ہے۔ اور بادی النظر میں ان کی گھر یا کمانیں بلکہ بعض حصوں گھر یا نوکیلی کمانیں اور کمان دار راستے بہت ہی شاندار خصوصیتیں شمار ہوتی ہیں۔ ایک عربی شاعر کہتا ہے ؎

غرناطۃٌ مالہا نظیرُ ما مصر ما الشام ما العراق
ماھی الا العروس تجلی والملک من جملۃ الصداق

یعنی غرناطہ کی دنیا میں نظیر نہیں نہ مصر، نہ شام نہ عراق اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس کی مثال ایک ایسی خوبصورت دلہن کی ہے جس کے مہر کا یہ کل ملک ایک حصّہ ہو سکتے ہیں۔

غرضیکہ متذکرہ بالا چند سطور مسلمانوں کی عظمت سلطنت اندلس کے متعلق واضح کرتی ہیں جسے سمندر میں سے ایک قطرہ تصوّر کرنا چاہیئے۔ کہ ایسے ایسے باکمال علماء و فضلاء اور ماہر فن کار عہد اسلامی میں جمع ہو گئے تھے کہ ان کے کارناموں نے ایک لاثانی اور غیر فانی نقش عام دُنیا کی تاریخ علوم و فنون میں چھوڑا ہے اور مسلمانوں کے اس ترکہ کا اثر آج یورپ پر بھی خاصہ ہے۔



سلاطین سلاجقہ

۲۵ محرم کو سلاجقہ کی فتح بغداد تاریخ اسلام میں ایک عظیم الشان کارنامہ تھا۔ اس عہد کا سب سے پہلا کارنامہ شیعہ ماحول کا اہلِ سنّت والجماعت میں تبدیل ہونا تھا۔ اور ہنروری، ہنر شناسی اور ہنر پروری اور ہنر افزائی جو بھی نظر آتی ہے اس کا سہرا وزیر نظام الملک (متوفی ۴۸۵ھ) کے سر ہے۔ یعنی ابوعلی الحسن بن علی قوام الدین نظام الملک حدیث اور فقہ کو اپنے وطن میں حاصل کرکے بلخ میں آکر علی بن شاذ کا منشی ہوا۔ جہاں سے وہ طوس کے ایک قریہ میں سلاجقہ کے دربار میں آیا۔ اور سلطان الپ ارسلان اور سلطان ملک شاہ سلجوقی کا وزیر رہا۔ اس نے نیشاپور، بغداد، ہرات، بصرہ، اصفہان، موصل، مخائل وغیرہ مقامات پر مدارس نظامیہ قائم کئے۔ یہ مدارس درس نظامیہ کے نام سے ہر طرف پھیل گئے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان میں تعلیم مُفت دی جاتی تھی۔ بلکہ طلبا کو وظائف بھی دئیے جاتے تھے۔ غزالیؒ جیسوں نے اسی مدرسہ نظامیہ میں تقریر کی ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے علوم وفنون کو مدرسہ نظامیہ کے نقشِ قدم پر فروغ دیا ان میں نورالدین محمود زنگی (متوفی ۵۶۹ھ) صلاح الدین (متوفی ۵۸۹ھ) جیسے قابل ذکر ہیں۔ غرضیکہ ان مدارس میں اطراف و اکناف سے علماء و فضلاء شامل ہوئے۔

سلطان[1] صلاح الدین نے متعدد مدرسے قائم کئے تھے۔ ان میں بقول ابن جبیر طالب علموں کو

[1] روضتین فی اخبار الدولتین۔

مکان، خوراک، حمام و ہسپتال تک سہولتیں تھیں۔ اور اس کے مدارس کے علماء کی تنخواہوں کا بجٹ تین لاکھ دینار سالانہ تھا۔ صلاح الدین کا تمام خاندان ایسی علمی فیاضیوں میں نامور تھا۔ بلکہ ان کی خواتین نے بھی کمی نہیں کی۔

ایک سوال عموماً یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ یہ تمام مدارس نظامیہ وزیر نظام الملک کے نام پر کیوں مشہور ہوئے۔ اور ان کے لئے سلجوق سلاطین کے نام کیوں استعمال نہ ہوئے۔ جن کے عہد میں یہ قائم ہوئے۔ بقول عوام، کہ نظام الملک عالم اسلام میں سب سے بڑا مصلح اور عظیم الشان شخصیت تھی۔ یہ طوس کے ایک قریہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے اسے عام طور پر طوسی لکھا جاتا ہے۔ اس نے محض اپنی ذاتی قابلیت کی وجہ سے ترقی کی۔ سلاطین سلاجقہ اسے اپنا باپ تصوّر کرتے تھے۔ بلکہ راقم کا خیال ہے کہ تمام تاریخ اسلام میں کماحقہ سلاطین سلاجقہ کے عہد کے فنی اور علمی کارنامے زیادہ تر بطور شخصی کارنامے مشہور ہوئے۔ ویسے اس عہد کی تاریخ اپنی علمی اور فنی خوبیوں کی وجہ سے سب پر سبقت رکھتی ہے بلکہ اس کے علاوہ صحیح علم و فن مستند طریق پر جو بازنطینی ثقافت کے اثر سے خالص اسلامی طور پر رو پذیر ہوا وہ انہی سلاطین کا کارنامہ ہے۔ یعنی اسلامی تاریخ تعلیم میں درس تدریس کے مطالب کے لئے بعض مقامات کا بیان کرتے ہوئے ہمیں اس زمانہ ۴۵۹ھ کو بھولنا نہیں چاہیئے۔ یہ بہت اہم زمانہ ہے۔ بلکہ باقاعدہ پہلا مدرسہ یہی مدرسہ نظامیہ نظام الملک کی حکمت عملی سے بغداد میں جاری کیا گیا۔ اگرچہ اس سے پیشتر بھی تعلیم و تعلّم کا دستور نجی طور پر مساجد، و مکانات اور دُکانات وغیرہ میں تھا۔ جیسا کہ جامع ازہر مصر میں اس سے پیشتر ۳۶۱ھ میں قائم ہو چکی تھی۔ مگر جسے ایک نظام عالم اسلامی تدریس کا لائحہ عمل کہنا بجا ہوگا۔ وہ نظام الملک ہی کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ اسی زمانہ میں یہ بھی ملتا ہے کہ بعض اوقات علماء و فضلاء نے نام و نمود کی پروا نہیں کی۔ بلکہ کسر نفسی سے کام لیا ہے۔ مگر دوسروں نے اس کے جوہر کو مدّنظر رکھ کر ان سے استفادہ کیا۔ چنانچہ جب نظامیہ مدارس عالم اسلام میں قائم ہوئے تو ہر کالج میں معلّم مقرر کئے گئے۔ نظام الملک نے خود بغداد کے مدرسہ کی مسند کے لئے مشہور ابو اسحاق الشیرازی کو مقرر کیا۔ مگر وہ اوّل دن موجود نہیں تھے جس کی وجہ سے

ابو نصر ابن الصّباغ نے اس کرسی صدر معلّم کو بیس یوم تک سنبھالا۔ اسی دوران میں نظام الملک نے خود شیرازی کے احساس پستی کو تسکین دی اور حوصلہ بڑھا کر کرسی صدارت پر بیٹھنے کی ترغیب دی (الصبّاغ) اس کی وجہ یہ تھی کہ نظام الملک نے طے کر لیا تھا کہ ان کے سوا اور کوئی شخص اس کا اہل نہیں ہے۔ ہمیں خوب علم ہے کہ آج تک عالم اسلام کے مدارس دینیہ میں درس نظامیہ یعنی نصاب تعلیم وہی قائم ہے اور اسے ہی روح و رواں سمجھا جاتا ہے۔ جو ابھی تک طے نہیں پایا تھا۔

شیخ ابو اسحاق شیرازی کے بعد درس تدریس کے فرائض مدرسہ نظامیہ ابو سعد عبد الرحمٰن بن محمد کے سپرد ہوئے مگر اس کے بعد پھر ابو نصر بن الصبّاغ اس فرض پر مقرر ہوئے۔ مگر ابن الصبّاغ کے بعد پھر اسی ابو سعد عبد الرحمٰن بن محمد ہی کو مقرر کیا گیا۔ جو تا وفات ۴۶۸ھ اس منصب پر فائز رہے۔

عہد سلاجقہ ایران کے فن تعمیر کے ضمن میں ہمیں نہایت وضاحت سے بیان کرنا چاہئے کہ آج تک بیس سے زیادہ آثار ایسے دریافت ہو چکے ہیں جو اس عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ورنہ آج تک اس ضمن میں کم توجّہ کی گئی تھی۔ ان میں سب سے اہم دو توں مسجد اصفہان کے گنبدی ایوان مع ملحقہ ستون دار تالار اور جامع زرادا۔ اردستان گل پائگان اور قزوین۔ ہمدان کا علویہ اور رے کا گنبد طغرل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن سے سلاجقہ کا مضبوط، قوی اور عالی شان طرز تعمیر واضح ہے۔ اور اس طرز نے ہی غزنین کے سلاطین کی تعمیرات پر خاصہ اثر کیا تھا۔ محققین کا متفقہ بیان ہے کہ اس طرز کو بروئے کار لانے والا نظام الملک تھا۔ اگرچہ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ عضد الدّولہ کی عمارت بیمارستان اور خلیفہ منصور عبّاسی کی[۱] بدبغداد سے خاصہ متاثر ہوا تھا۔ جب بغداد میں وہ مدرسہ نظامیہ کی تعمیر کرا رہا تھا تو اس نے یہ فریضہ ایک ماہر تعمیر ابو سیّد احمد بن محمد صوفی نیشاپوری کے سپرد کیا تھا۔ مگر جب کام ختم ہوا تو نظام الملک کو یہ اطلاع ملی تھی کہ ابو سیّد نے روپیہ کو جو تعمیر کے لئے اس کے قبضہ میں تھا خورد برد کیا ہے۔ اُدھر جب ابو سیّد کو یہ معلوم ہو گیا کہ اس کا یہ فعل وزیر نظام الملک پر منکشف ہو گیا ہے تو وہ بصرہ بھاگ گیا۔ مگر اس نے فوراً توبہ کی

---

[۱] کامل ابن اثیر ج ۱۰، ص ۳۸۵

اور بغداد واپس آگیا۔ اور آتے ہی نظام الملک کے سامنے نہایت عجز و انکساری سے عرض کی: "آپ نے پروردگار کو خوش کرنے کے لئے مدرسہ تعمیر کیا ہے خدا ہی کو اس سے معاملہ طے کرنے دو جس نے اس عمارت کی تعمیر میں غدّاری سے کام لیا ہے"۔ نظام الملک نے جواب دیا۔ کہ میرا غم و غصّہ روپیہ کے لئے نہیں ہے جسے تم نے یا کسی اور نے چرا لیا ہے بلکہ مجھے افسوس اس وقت کا ہے جو ضائع ہو گیا ہے اور جس کا اب کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ مدرسہ جامع منصور اور بیمارستان عضد الدّولہ کی طرح تعمیر ہوتا کیونکہ میں نے سُنا ہے کہ انھوں نے چُونہ کے مسالہ کی ایک بید کی ٹوکری ہر اینٹ کے لئے استعمال کی تھی اور مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم نے روپیہ کو کاشی کاری کی اینٹوں پر ہی صرف کر دیا ہے۔ اور خطرہ ہے کہ جلد ہی گر پڑے۔[1]

الطرطشی نے اپنی تالیف سراج الملوک (۵۱۶ھ) میں اس سے کسی قدر مختلف لکھا ہے کہ ایک شخص ابوالسّعید نے اپنے آپ کو نظام الملک کے سامنے پیش کر کے عرض کی کہ اے امیرالمومنین اگر اجازت ہو تو میں آپ کے لئے ایک مدرسہ بغداد میں تعمیر کر دوں۔ جو دنیا بھر میں لاثانی ہوگا، اور تمہارا نام قیامت تک زندہ رہے گا۔ نظام الملک نے اس تجویز کو قبول کیا۔ نظام الملک نے بغداد میں کارپردازان وقت کو لکھا کہ اس شخص کو روپیہ اس کی مرضی پر رکھ دیا جائے۔ تب اس نے دجلہ کے کنارے ایک ٹکڑہ زمین خرید کیا اور نظامیہ کا نقشہ تیار کر کے اسے تعمیر کیا۔ اس کی پیشانی پر نظام الملک کا نام لکھ دیا۔ اس کے گرد و نواح میں کافی بازار وغیرہ تعمیر کئے اور اس کے لئے سرائے وغیرہ بھی مہیا کیں جن کی آمدنی اس مدرسہ کے لئے وقف کر دی۔ اس کے بعد اس ابوسعید نے تمام حساب نظام الملک کے پاس پیش کیا۔ جس کا میزان ساٹھ ہزار دینار تھا۔ نظام الملک کے دفتر نے پڑتال پر معلوم کیا کہ اس پر دراصل ساٹھ ہزار کی بجائے نو ہزار دینار خرچ ہوئے ہیں اور باقی دینار وہ خود کھا گیا ہے۔ نظام الملک نے اس ابوسعید کو اصفہان میں تمام حساب پیش کرنے کو حکم بھیجا۔ ابوسعید مجرمانہ ذہنیت لیکر بغداد میں خلیفہ عباسی کے روبرو گیا۔ اور تجویز پیش کی کہ اگر آپ ساٹھ ہزار دینار دیدیں تو میں آپ کا نام بجائے نظام الملک کے اس مدرسہ کی پیشانی پر لکھے دیتا ہوں۔ خلیفہ اس پر راضی

---

[1] تجارب السلف از ہندوشاہ، مرتبہ عباس اقبال طہران ۱۹۳۴ء ص ۲۷۰ تا ۲۸۱

ہوگیا۔ اور روپیہ کا اُسے حکم بھی دیدیا۔ جب ابوسیدؒ کو تسلی ہوگئی کہ اس کی تجویز کارگر ہوگی تو تب وہ اصفہان چلا گیا تاکہ نظام الملک کی حساب کی پڑتال کا پورا جواب دے۔ جاتے ہی اس نے کہا۔ کہ گفتگو کو زیادہ طویل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ میرے کام سے مطمئن نہیں ہیں تو میں آپ کا نام مدرسہ کی پیشانی سے نکال کر کسی اور کا نام لکھ دوں گا۔ آپ کسی آدمی کو میرے ہمراہ بھیج دو کہ وہ تمام رقم جو آپ نے میرے حوالے کی تھی واپس لے آئے۔

نظام الملک نے جواب دیا اے شیخ! ہم حساب کو تو در گذر کرتے ہیں مگر میرے نام کو وہاں سے مت نکالیں۔ اس روپیہ سے جو ابوسیدؒ نے اس طرح حاصل کیا تھا۔ بے شمار خانقاہیں صوفیائے کرام کے لئے اور سرائے رباط، باغات اور مکانات خرید کر کے صوفیوں کے لئے وقف کر دئے۔[51]

ابن جبیر[52] مشہور اُندلسی سیّاح نے بغداد کے مشرق میں تین ایسے مدرسوں کا مشاہدہ سنہ ۵۸۰ھ میں کیا۔ مگر نظامیہ ان سب میں بڑا تھا۔ ہندو شاہ نے بھی بیان کیا ہے کہ نظام الملک نے مدرسہ نظامیہ جو بصرہ میں تعمیر کیا تھا وہ زبیر ابن العوامؓ کی قبر کے قریب تھا۔ اور یہ نظامیہ بصرہ، نظامیہ بغداد سے زیادہ عظیم الشّان اور خوبصورت تھا۔ اور یہ سنہ ۶۲۷ھ میں خلیفہ معتصم کے زمانہ میں گر گیا تھا۔ اور اس کی لکڑی و دیگر مسالہ بصرہ لائے گئے تھے۔ اور ایک اور مدرسہ کی تعمیر میں یہ مسالہ استعمال کیا گیا تھا۔ اور اس کا بھی یہی نام نظامیہ تھا۔ قدیم نظامیہ بغداد کے آثار ہنوز باقی تھے۔ غرضیکہ نظام الملک طوسی کا شوق برائے قیام مدارس ایک جنون کے درجہ تک پہنچا ہوا تھا۔ اور اسی میں ہر وقت منہمک رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس کی کوششیں ضرب المثل ہو چکی ہیں۔ اور جب کبھی علوم دین کے مدارس کے قیام کا ذکر آتا ہے فوراً نظامیہ کو نمونہ تصور کیا جاتا ہے۔

سلاطین غزنہ

نوح بن منصور سامانی نے جو کتب خانہ بخارا میں قائم کیا تھا وہ اس زمانہ میں بہت سی حیثیتوں

---

[51] الطرطوشی۔ سراج الملوک۔ اسکندریہ سنہ ۱۲۸۹ھ ص ۲۱۷-۲۱۸ - ابن خلکان ص ۱۵ [52] سفرنامہ ابن جبیر لندن سنہ ۱۹۰۷ء ص ۲۲۹

کے لحاظ سے بے نظیر خیال کیا جاتا تھا۔ اس عدیم المثل کتب خانہ سے جہاں ہر علم وفن کی کتابیں موجود تھیں شیخ الرئیس بوعلی سینا نے کماحقہٗ استفادہ کیا۔ ابن سینا کے بیان سے ہم اس کتب خانہ کی قطع وضع کا بھی اندازہ کرتے ہیں۔ یعنی یہ ایک بہت بڑا مکان تھا۔ جس میں بہت سے کمرے تھے ہر کمرے میں متعدد صندوق تھے جن میں کتابیں اوپر تلے رکھی ہوئی تھیں۔ ہر فن کے لئے جدا کمرہ تھا۔[1]

اب ہم ذرا فارسی علم وادب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے ابوصالح منصور بن نوح سامانی والیٔ بخارا پر نظر پڑتی ہے جس کے فرمان سے امام ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ کی ہر دو مشہور تفسیر و تاریخ کے فارسی تراجم کے لئے ایک جماعت علما بخارا، سمرقند، بلخ، فرغانہ وغیرہ مقامات سے جمع کر کے کام سپرد کیا گیا جو ۳۴۵ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ غرضیکہ ایک طرح فارسی علوم کی درباری سرپرستی کی۔ یہ ایک ابتداء تھی بلکہ یوں کہئے کہ ان عربی تالیفات کا یہ دارالترجمہ قائم ہوا جو خلفاء عباسیہ کے دربار میں تیار ہوئی تھیں۔ سامانیوں کے بعد سلاطین غزنہ ان کی جگہ لیتے ہیں۔ جو ان سامانیوں ہی کے پروردہ تھے۔ ان میں سے بالخصوص سلطان محمود کی فتوحات جس طرح بہت مشہور ہیں اسی طرح اس عہد کے فارسی علم ادب کا چرچا بھی کم نہیں ہے۔ جس نے تھوڑے عرصہ میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ یعنی ایک بادشاہ کی ہنر پرور طبیعت نے اہل ہنر کی وہ ہنر افزائی کی کہ ہر صاحب ہنر ہی نہیں بلکہ ہر فرد بشر اس فضا میں سرشار نظر آتا ہے۔ اگر ہم تھوڑے سے وقت کے لئے تصوّر کر لیں کہ یہ سب کچھ نہیں ہوا تو ہمیں اس کے برعکس بھی یہ سوچ لینا چاہئے کہ کیا اس صورت میں شاہنامہ فردوسی و دیگر شعراء دربار غزنہ کا کلام میسّر آسکتے تھے۔ ہر گز نہیں۔ اور اس دربار میں ملک ایاز بن اویماق ابوالنجم منظور نظر سلطان محمود کے واقعات پیش آئے جس کیلئے عنصری کی بدیہہ گوئی ضرب المثل ہے۔

مشہور ہے کہ ایک مرتبہ سلطان محمود نے مجلس نشاط و طرب میں ایاز کی زلفیں کٹوا دیں۔

---

[1] ابن خلکان تذکرہ ابن سینا۔

جو اس وقت اس کے رُخ پر کسی قدر اس کے حسن کو دوبالا کرنے میں حائل نظر آئیں۔ اس کے بعد خود سلطان کی طبیعت اس کی کٹی ہوئی زلفوں کی حالت میں دیکھ کر بہت مکدّر ہوئی۔ اور اپنے ذاتی فرمان پر تاسّف کیا جس کی تعمیل ایاز نے بغیر کسی حجت کے فوراً کی۔ جب محمود کے دربار کے ملک الشعراء عنصری کو اس کا علم ہوا تو اس نے سلطان کی طبیعت کو بحال کرنے کی نیّت سے دربار میں فوراً پہنچ کر فی البدیہہ رباعی ذیل پڑھی ؎

گر عیب سر زلف ست از کاستن است چہ جائے بہ غم نشستن و خاستن است
جائے طرب و نشاط و می خواستن است کاراستن سرو ز پیراستن است

"یعنی اگر معشوق کی زلفیں ترش گئیں تو یہ رنج کی کیا بات ہے۔ یہ تو خوشی و مے نوشی کا موقع ہے کیونکہ سرو جب چھانٹ دیا جاتا ہے تو اور زیادہ موزون ہو جاتا ہے"۔

سلطان محمود عنصری کی اس بدیہہ گوئی سے اس قدر خوش و محظوظ ہوا کہ حکم دیدیا کہ عنصری کا منہ موتیوں سے بھر دیا جائے۔ اسی طرح جوامع الحکایات عوفی میں محمود و ایاز کے متعلق اور بہت سی حکایات ہیں۔

سلطان محمود نے غزنہ میں مسجد فیروزہ جو مسجد اموی دمشق کے نقشہ پر تعمیر کی تھی[1] اس کے ساتھ تمام ضروریات بھی تعمیر کیں۔ یعنی علمائے کرام کے لئے جائے رہائش۔ مدرسہ، کتب خانہ اور پھر ان سب کے علاوہ علماء و طلباء کے تالیف قلوب کے لئے وہاں ان کے خورونوش کا انتظام بھی خاطر خواہ کیا۔ غزنوی عہد کے سلاطین غزنہ کے علمی و فنی کارنامے تاریخ عالم میں ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ اس عہد کے دوسرے شعراء جن میں رنبقی، فرّخی، عنصری، طوسی، منوچہری حکیم سنائی وغیرہم ہیں۔ سب قابل فخر ہستیاں ہیں جن کا کلام ایک دوسرے سے بڑھ کر ہے۔ اور دنیا اس کی مثال نہیں پیش کر سکتی۔ ان درباری شعراء نے سلاطین غزنہ کی جو تصویر اپنے کلام میں پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دَور میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو محض اس عہد کے ثقافتی سیاسی، تاریخی وغیرہ حالات کو قلمبند کرنے کے لئے پیدا کیا تھا۔ اس عہد کا علمی و فنی شاہکار اس

---

[1] ہسٹری آف پرشیا براؤن۔ جلد دوم

عہد کے مختلف پہلوؤں کا آئینہ معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ سب کچھ ان سلاطین کے ذاتی ہنر پرور لب و لہجہ کا نتیجہ ہے ورنہ آج کچھ بھی نہ ہوتا۔

سلاطین فارس

متذکرہ بالا سلاطین سلاجقہ کے ضمن میں عمر خیامؔ کا ذکر نظر انداز کرنا ایک بہت بڑی بھول ہوگی جب کہ ہر پہلو سے ان کے عہد میں علوم و فنون میں ترقی اور ان کو سرپرستی حاصل ہوئی کہ اس کا مفصل بیان بذاتِ خود تاریخ کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ خاص کر عمر خیام کی رباعیات میں ایک ایسی شان نظر آتی ہے جو آج تمام عالم سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اور دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں رباعیات عمر خیامؔ کا ترجمہ نہ ہوا ہو۔ اس طرح اس عہد کے انوری کے قصائد، عطار و نظامی کی مثنویاں وغیرہ خاص امتیاز رکھتی ہیں۔ غرضیکہ یہ سب ان سلاطین کے دربار کی ہنر شناسی اور ہنر پروری کا نتیجہ ہیں ورنہ آج ان کا وجود بھی نہ ہوتا۔

نصیر الدّین طوسی کا ذکر اس ضمن میں ناگزیر ہے کہ اس نے اپنے زمانہ میں دیگر علماء و فضلاء کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ ہلاکو خاں کی ملازمت میں شامل ہوا۔ جو اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ جب ہلاکو نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ تو یہ اس کے ہمراہ تھا۔ سب سے اوّل جو کارنامہ اس نے انجام دیا وہ یہ تھا کہ اس نے بے شمار کتب خانوں کو تباہی سے بچا لیا۔ اگرچہ اس نے خود ان کو اپنے ذاتی کتب خانہ میں شامل کر لیا۔ بقول ابن شاکر ان کتابوں کی تعداد چار لاکھ سے زیادہ تھی۔ یہ ہلاکو خاں کے دربار میں منجم کی حیثیت سے تھا اور ہمیشہ اس سے ستاروں کے ضمن میں مشورہ کرتا تھا۔ علاء الدین جوینی صاحب دیوان کی زندگی کو اسی نے بچایا تھا۔ اور اسی طرح بہت سے علماء و فضلاء کو اس نے ہلاکو خاں کے ظلم سے نجات دلائی۔ اس سے بڑا کارنامہ مراغہ کی رصد گاہ ہے جسے عام طور پر زیچ ایلخانی کہتے ہیں۔ اس کا انتقال ۶۷۲ھ میں بغداد میں ہوا۔ وہ کم و بیش پچاس ساٹھ کتابوں کا مصنف ہے۔ اکثر ان میں عربی میں ہیں۔ اس نے فارسی

میں اشعار بھی کہے ہیں۔ اور آج اخلاق ناصری کے نام سے زیادہ مشہور ہے خاص کر سائنس اور حکمت پر اس شخص نے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ یعنی طبیعات، الٰہیات، ریاضیات، فلسفہ وغیرہ یہاں ہمیں نصیر الدین طوسی پر کوئی مستقل مقالہ لکھنا مقصود نہیں۔ اور محض اس محقق کی ہنر شناسی اور فضلاء کی سرپرستی کا ذکر مقصود ہے۔ اس لئے مختصر طور پر ذکر کافی ہے۔ مگر ایک امر کا اقرار کرنا پڑے گا۔ کہ اس شخص کے سوانح حیات بتاتے ہیں کہ یہ بذاتِ خود ایک محکمہ تھا جہاں سے کتابیں مختلف مضامین پر تیار ہو کر نکلتی تھیں۔ اسی وجہ سے اسے عام طور پر محقق کہتے ہیں۔ اس کا اپنے معاصرین کے ساتھ جو مربیانہ اور مساویانہ سلوک تھا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ راقم کے نزدیک اس دور کی یہ سب سے بڑی شخصیت تھی۔ جس کے اثر و حسن سلوک سے بے شمار علماء و فضلاء ظہور میں آئے۔ ان میں ابن الفوطی صاحب کتاب مجمع الالقاب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس سے طوسی کی اپنی شخصیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔

ابتدائی صدیوں میں کتابوں کی تجارت

آخر علم و فن کا فروغ کتابوں کے سہولت سے فراہم ہونے پر بھی موقوف ہے اور اس کا بیان ہمیں ان علماء و فضلاء کے تراجم میں جستہ جستہ ملتا ہے جن میں بعض اوقات بہت ہی دلچسپ واقعات ملتے ہیں کہ مسلمانوں نے کتاب کی کتابت و ترتیب و تجلید و کاغذ کے انتخاب وغیرہ میں خاص ذوق سلیم کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ ذیل میں مختصر طور پر کتابوں کے لین دین کو بیان کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ بڑے سے بڑے مصنفین اور مؤلفین اس میں حصہ لیتے تھے۔ علم پروری اور ہنر شناسی کے ضمن میں یہ بحث بھی بہت اہم تھی۔

عام طور پر ہم مسلمان مصنفین کے علمی کارناموں کو نہایت فخر سے پیش کر کے بتلاتے ہیں کہ فلاں مصنف کی تصنیفات بیشمار جلدوں میں ہیں۔ اور ان کے نسخے اس زمانے میں امراء اور دیگر شائقین و مصنفین تک بھی پہنچ گئے تھے۔ اس صورت میں یہ باور کرنا پڑتا ہے کہ کاغذ کی

فراہمی اور ان کتب کو تیار کر کے دیگر لوگوں کے ہاتھوں تک پہنچانے کے وسائل بھی ضرور مہیا تھے۔ اور لوگ باخبر تھے کہ ان کی کہاں کہاں منڈیاں تھیں۔ ورنہ اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا۔ اس مختصر مقالہ میں محض کتابوں کی تجارت کو ابتدا سے لیکر آٹھویں نویں صدی ہجری تک محدود کر کے چند واقعات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ ویسے ہمیں مربوط اور مبسوط صورت میں کوئی تحریر نہیں ملتی جسے اس نقطۂ نگاہ سے جمع کیا گیا ہو۔

یہ ایک واضح بات ہے کہ عرب میں کاغذ نہیں تھا۔ لوگ کھال یا پتّوں وغیرہ پر تحریریں ثبت کر لیتے تھے۔ مگر جب مسلمانوں نے اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کیا اور وسط ایشیا میں سمرقند فتح ہُوا۔ تو وہاں کے قیدیوں میں چند چینی بھی تھے۔ جن میں سے بعض کاغذ سازی کے ماہر تھے۔ انہوں نے بغداد میں مسلمانوں کو کاغذ بنانا سکھایا۔ جس سے آہستہ آہستہ کاغذ کی فراہمی شروع ہوئی۔ اور اسی طرح وہ سامان بھی مہیا ہونا شروع ہو گیا جو تحریر وغیرہ کے لئے ضروری تھا۔ اس کے لئے عام طور پر مسلمانوں نے "وراقت" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو آج ہمارے ہاں لفظ "سٹیشنری" سے مراد لیا جاتا ہے۔

اندازہ کیجئے کہ کیسے باکمال لوگ دوسری تیسری صدی ہجری میں تصنیف و تالیف اور ان کی نشر و اشاعت میں مصروف تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مسوّدات کی تیاری و فراہمی کیلئے کاغذ و دیگر وسائل کی موجودگی ضروری تھی۔ بہرحال ہمیں اس زمانہ میں ایک عالم کتب فروش کا پتہ چلتا ہے جس کا نام اور لقب تھا "الفرج محمدؐ بن اسحاق الندیم"۔

عام طور پر وہ "ابن ندیم" کے نام سے اور صاحب "کتاب الفہرست" کی حیثیّت سے زیادہ مشہور ہے۔ وہ بغداد کا باشندہ تھا۔ حسن اتفاق سے آج اس کی شہرۂ آفاق کتاب مطبوعہ صورت میں میسّر ہے۔ یہ کتاب جرمنی کے ایک مقام لیپزگ میں ۱۸۷۲ء میں زیر ادارت فاضل فلوگل طبع ہوئی تھی۔ جب کہ یہ پیرس کے مخطوطہ تک محدود تھی۔ مگر بعد میں مصریوں نے اسے ۱۳۴۸ھ (۱۹۲۹ء) میں بعد کے دریافت شدہ دیگر مخطوطوں کی مدد سے

کسی قدر اضافوں کے ساتھ طبع کیا۔ ابن ندیم کو عام طور پر سوانح نگاروں نے "وراق" یعنے کتب فروش لکھا ہے۔ جس کی دکان بغداد کے دارالروم میں بیعۃ کے پیچھے تھی۔ جہاں عام طور پر رومی لوگ رہتے تھے۔ یہ شخص ۲۹۷ ہجری میں پیدا ہوا۔ اور ۳۸۵ھ میں وفات پائی۔ بعض لوگوں نے لفظ "وراق" سے کاتب کے معنی لئے ہیں۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ کتابوں کا کاروبار کرتا تھا۔ آخر اس نے ۳۷۷ھ میں ان تمام کتابوں کی جو اس کے قبضہ میں تھیں یا اس کے ہاتھوں سے دوسروں تک پہنچ چکی تھیں ایک یادداشت بطور فہرست تیار کی جو آج کتاب الفہرست کہلاتی ہے۔

اس مطبوعہ فہرست پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج یورپ کے کتب فروشوں نے جو طریقہ اپنی مطبوعات کی فہرستوں کو مرتب کرنے کا اختیار کر رکھا ہے وہ براہ راست اسی الفہرست ابن ندیم کا چربہ ہے، جو ہزار سال سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ اور وہ فہرست بغداد کی ایک دکان سے شائع ہوئی تھی۔ جب کہ نہ پریس تھا اور نہ کاغذ کی فراوانی تھی۔ نہ کاتبوں کو سہولتیں میسر تھیں اور نہ سٹیشنری کے سامان کی افراط تھی۔ ابن ندیم نے اس فہرست میں مصنفین کے مختصر حالات مضامین کے تحت عنوان قائم کر کے ان کی کتب کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی خاص خاص خوبیوں کو بھی بیان کر دیا ہے۔ اس فہرست میں اس اطلاع کو محض اس وقت تک کی کتب یا محض مسلمان مصنفین عرب تک محدود نہیں رکھا بلکہ چین، ہندوستان، روم اور ایران وغیرہ تک کی متداول کتب اور ان کے مصنفین کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ ہم ہندوستان کے متعلق یہ دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ جہاں مذاہب پر کتابوں کا ذکر آیا ہے وہاں ابن ندیم نے اہل ہند کے "مواضع العبادات" کا بھی ذکر کیا ہے۔ خاص کر بدھ مت کی کتابوں اور ان کے مصنفین کا ذکر جو آج ہم بدھ مت کی کتابوں سے بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

الفہرست ابن ندیم میں وصف لغات الامم من العرب والعجم سے۔ ابتدا کر کے خط اور اس کے اقسام تک گنا کر قرآن کریم تک بحث کر دی ہے۔ یعنی قدیم اور معاصر قرآن کریم کے

لکھنے والوں پر اور قرآن کریم کو مطلاّ و مذہّب کرنے والوں پر۔ اس کے علاوہ اس زمانے کے مصنفین اور شائقین کتب میں ایک رابطہ تھا اور کتب فروش کو گاہک اور اس کے رجحان طبیعت کا جو علم ہوتا ہے وہ اس کتاب سے واضح ہے۔ ہم یہ دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں کہ شعبہ قرآن پر کیا کیا تصانیف ہوئیں۔ اور پھر یونانی طب اور موسیقی پر کیا کچھ تصنیف ہؤا۔ اور کون کون ماہر موسیقی تھے۔ بت پرستوں اور غیر مسلموں کے عقائد کی کتب کیا کیا تھیں۔ غرض یہ فہرست بجائے خود ایک انسائیکلو پیڈیا کا حکم رکھتی ہے۔ یورپ میں جو آج انڈکس کا سسٹم ہے وہ بھی ایسی ہی کتب اسلامی سے لیا گیا ہے۔ اور کوئی شعبہ نظر نہیں آتا جس پر کوئی کتاب تصنیف نہ ہوئی ہو۔ اس مطبوعہ فہرست کے سوا پانچ سو صفحات کی تعداد سے کہیں زیادہ علوم و فنون اور ان کے مصنفین کا ذکر بھی آ گیا ہے۔ فہرست بغداد کے اس عہد کی چوتھی صدی کی پیداوار ہے جب کہ عباسیوں کا طوطی بول رہا تھا۔ اور جن کی علمی سرگرمیاں اور فیاضیاں آج بھی ضرب المثل ہیں۔

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ کتابوں کی تجارت نے عہد اسلامی میں ایک خاص اہمیت اور شہرت اختیار کر لی تھی۔ اور کتابوں کی دکانیں ہر بڑے شہر میں قائم تھیں۔ اور وہیں ان کے لئے کاغذ بنانے کے کارخانے بھی تھے۔ یعقوبی نے اپنی کتاب البلدان میں لکھا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں محض بغداد میں تین سو دکانیں کتابوں کی تھیں۔ اور مقریزی نے اپنی کتاب " الخطط والآثار مصر" میں لکھا ہے کہ مصر کتابوں کی بہت بڑی منڈی تھا۔ اور خطیب بغدادی نے اپنی مشہور تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں بغداد میں کتابوں کی تجارت بہت زوروں پر تھی۔ اور تمام دکانیں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ جن سے ظاہر ہے کہ وہ تمام عنوانات اور مضامین پر مشتمل تھیں۔ بلکہ ان کتب کے گہرے مطالعہ سے یہ بھی واضح ہو گا کہ کتابوں کی دکانیں عام طور پر مساجد کے قرب و جوار میں ہوتی تھیں اور کتب فروش کتابوں کے پشتوں پر ان کے ناموں کی نشاندہی کر دیتے تھے تاکہ تلاش کے وقت سہولت ہو۔

کتابوں کی فروخت عام بازار میں جاکر خریدنے کے علاوہ نجی طور پر بھی ہوتی تھی۔ بلکہ اس کے علاوہ بذریعہ نیلام بھی ہوتی تھی۔ جو آدمی یہ کام کرتا تھا اسے منادی کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اور اکثر کتابوں کے تاجر بڑے بڑے فضلار وادبا وعلمار بھی ہوتے تھے۔ جیسا کہ ابن ندیم کے سلسلے میں بیان ہوچکا ہے۔ یعنی یہ لوگ علم سے معرّا نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ کتابوں کی تجارت عام طور پر بہت اہم عمل اور ذمہ داری کا کام تصوّر کیا جاتا تھا ان میں قابل ذکر ابوالقاسم سہل بن محمد السجستانی (۲۵۰) یاقوت حموی متوفی (۶۲۶ھ) وغیرہ ہیں جن کی کتابیں آج ہمارے لئے صرف چراغ ہدایت کا کام ہی نہیں دیتی بلکہ آج اسلامی تاریخ اور ادب وثقافت کے بے مثل علمی کارنامے بھی شمار ہوتی ہیں۔

بعض لوگ اپنی کتابوں کی نکاسی کے لئے ایجنٹ بھی مقرر کرتے تھے۔ جن کو عام طور پر "دلال الکتب" کہتے تھے۔ وہ کتابوں کو مہیا کرنے کے بعد خود ہی پہنچا بھی آتے تھے۔ جیسا کہ مشہور شاعر خضیری متوفی ۵۸۶ھ کے ذکر میں ملتا ہے۔ جس کا نام اپنے اصلی نام کے علاوہ "دلال الکتب" بھی مشہور تھا۔ اسی طرح ایک اور دلال ابوجبہ بن صورۃ متوفی ۶۰۷ ہجری مصر میں تھا جو کتابیں پھیلا کر اپنے گھر کی چوکھٹ پر بیٹھ جاتا تھا۔ اور فضلاء وعلماء اس کے ہاں اکثر پیر اور منگل کے روز کتابیں خریدنے آتے تھے۔ جیسا کہ ابن خلکان نے ذکر کیا ہے۔

یہ ایک مزید دلچسپی پیدا کرنے والا امر ہے کہ بعض نابینا عالم لوگ بھی کتابوں کا لین دین کرکے اپنا گذارہ کرتے تھے۔ جیسا کہ مشہور حلبی فاضل احمد بن زین الدین الآمدی نابینا آٹھویں صدی ہجری میں کتابوں کی تجارت کرتا تھا۔ اور وہ ہر کتاب کی قیمت جو اس کے ہاں ہوتی تھی اس سے خوب واقف ہوتا تھا۔ کیونکہ خود جب کوئی کتاب خریدتا تھا وہ کاغذ کا ایک کنڈل بناکر ابجد کے حروف کے مطابق نشان کرکے کتاب کے اندر چسپاں کر دیتا تھا۔ پھر اس پر کاغذ کا ایک خول چڑھا دیتا تھا۔ تاکہ وہ نشان اُبھرا رہے۔ جس پر اپنا ہاتھ پھیر کر وہ آسانی سے قیمت بتا دیا کرتا تھا۔ ایک اور نابینا فاضل احمد بن سرو السمستری متوفی ۵۱۱ھ

جو بڑے پایہ کا محدث تھا اپنے زمانہ میں کتابوں کی قیمتیں بتانے اور ان کی جانچ پڑتال میں بہت ماہر تصوّر کیا جاتا تھا۔ ایک اور شافعی عالم شفیع بن علی الکنانی نابینا مصر کا شاعر اور ادیب تھا۔ جس کا انتقال ۷۳۰ھ میں ہوا تھا۔ یہ شخص نابینا ہونے کے باوجود کتابوں کی قیمتیں بتلانے میں ماہر تصوّر کیا جاتا تھا۔ کتاب کو ہاتھ میں لیکر اس کی کیفیت بتا دیتا تھا بلکہ اس سے اندازہ کر کے یہ بھی بتا دیتا تھا کہ کس پچھلی تاریخ کو خریدی گئی تھی۔ اسی طرح بعض کتابوں کی تجارت کرنے والوں کی بیویاں بھی ان کی غیر حاضری میں کتابوں کے کاروبار میں حصّہ لیتی تھیں۔ کیونکہ وہ ان کی قیمتوں سے آگاہ ہوتی تھیں۔ چنانچہ اس متذکرہ نابینا شخص شافعی شفیع کی بیوی ہر کتاب کی قیمت سے پوری واقفیت رکھتی تھی۔ بلکہ یہ عورت اپنے شوہر کی وفات کے بعد عسُرت کے زمانہ میں پرانی کتب کو برابر فروخت کرتی رہی۔ کیونکہ مرحوم نے اپنے بعد اٹھارہ مختلف مجامع کتب کا ترکہ چھوڑا تھا۔

جُوں جوں کاغذ کی فراوانی ہوتی گئی کتابوں کی قیمتوں میں بھی کمی ہوتی گئی۔ ابن دُرید کی مشہور کتاب جمہرۃ الانساب پانچویں صدی میں ایک مرتبہ ساٹھ دینار یعنی قریب چارسو پچیس روپیہ میں فروخت ہوئی۔ اسی طرح طبری کی مشہور تاریخ یک صد دینار یعنی سات سو روپیہ میں فروخت ہوئی۔ ایک اموی شاعر جرید کا دیوان دس دینار میں بکا جو آج ۷۰ روپیہ کے برابر ہوں گے۔ ایک سر بند خلیل بن احمد کی مشہور تصنیف کتاب العین جسے ایک کتب فروش خراسان سے بصرہ منڈی میں لایا تھا پچاس دینار یعنی تین سو پچاس روپیہ میں فروخت ہوئی بعض محققین نے اندازہ لگایا ہے کہ بغداد میں خلفائے بنو عباسیہ کے زمانہ میں کتاب کی اوسط قیمت ایک دینار تھا۔ اگرچہ بعض اوقات قیمتی کتب کم داموں پر بھی میسّر آجاتی تھیں۔ ابن سینا کے ذکر میں بیان کیا جاتا ہے کہ ارسطو کی الٰہیات کو اس نے چالیس مرتبہ پڑھا۔ اور آخر حفظ کرلیا۔ تاہم وہ اسے پوری طرح سمجھ نہیں سکا۔ ایک شام وہ کتب فروشوں کی منڈی میں گیا۔ جب کہ ایک منادی کرنے والا کتاب کا نیلام بول رہا تھا۔ اس نے ابن سینا سے درخواست کی کہ

آپ اسے خرید لیجئے۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ اب یہ بے سود ہے۔ منادی نے پھر ترغیب دی کہ خرید لو یہ بالکل سستی ہے۔ کوئی قیمت ہی نہیں ہے۔ یعنی تین درہم (ہمارے ایک روپیہ ۲ آنے کے برابر)۔ کتاب کا مالک نقدی کی اشد ضرورت میں تھا۔ آخر کار کتاب خرید لی گئی۔ اور خریدار کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب اس کے ہمراہ فارابی کی شرح ارسطو کی الٰہیات کی بھی تھی۔ جس نے اس کے تمام شکوک اور مشکلات کا ازالہ کر دیا۔ ابن سینا نے شکرانہ میں غربا کو کھانا کھلایا۔ کہ اسے ایسا بیش بہا خزانہ مل گیا ہے۔

کتابوں کی منافع بخش تجارت کو خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں بہت فروغ ہوا۔ اور یہ تجارت محض پیشہ ور تاجروں تک ہی محدود نہ تھی۔ لیکن علماء و فضلاء اکثر اوقات ان کتابوں کی خاطر جو ان کے پاس نہ ہوتی تھیں اپنی موجودہ کتابوں سے تبادلہ بھی کر لیتے تھے۔ اور بعض اوقات اپنے پریشان کن حالات کے تحت ان کو فروخت بھی کر دیتے تھے۔ جس کی بہترین مثال ابوحاتم السجستانی متوفی ۲۵۰ھ کی ہے۔ جس کے ہاں بہت بڑا ذخیرہ کتب کا تھا۔ اور وہ خود بھی تجارت کرتا تھا۔ یہ وہ شخص ہے جس کا ذکر نسائی نے اپنی سنن میں اور البزاز نے اپنی مسند میں کیا ہے۔ اور یعقوب الشیرازی الفیروز آبادی مشہور مصنف قاموس متوفی ۸۱۶ھ جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے کئی اونٹوں کے بوجھ کی کتابیں جمع کی تھیں اور ہمیشہ ان کو سفر و حضر میں ہمراہ رکھتا تھا۔ وہ عسرت کی حالت میں اپنی کتابیں فروخت کر دیتا تھا۔ یاقوت حموی نے ارشاد میں ابن حمدون ۶۰۸ھ کے متعلق نہایت دردناک واقعہ نقل کیا ہے۔ کہ وہ کتابوں کا بہت بڑا عاشق تھا۔ اس نے ایک تعداد کثیر پچاس سال کے عرصہ میں جمع کی تھی۔ جب اسے سرکاری ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ تو اس کی حالت مزید پریشان ہو گئی۔ یاقوت بیان کرتا ہے کہ اس نے اس کو بغداد کے بازار میں آبدیدہ ہو کر اور دل خراش حالت میں اپنی کتابیں بیچتے دیکھا۔ جیسا کہ کوئی اپنے محبوب کو اپنے سینے سے جدا کر رہا ہو۔

ابن ندیم نے خود لفظ "وراق" استعمال کرتے ہوئے ملوک (بادشاہوں) کتّاب اور خطبا کے حالات کے تحت بہت سے لوگوں اور ان کی صحبت کا ذکر کیا ہے۔ جن میں سے الفتح بن خاقان کے ذکر کے تحت لکھا ہے کہ وراقین کی دکانوں سے جو کتابیں ملتی تھیں ان میں اس مصنف کی ایک کتاب "البُستان" جو اسی کی طرف منسوب تھی، وہ بھی ملتی تھی۔ بلکہ اسی مقام پر اس نے وراق سے کاتب کا مفہوم لیکر بیان کیا ہے کہ مسندی بن علی، اسحاق موصلی المغنی المامون والرشید کا وراق تھا جو اس کے گیت یا گانے یا غزلیات لکھا کرتا تھا۔ اور منافع خاص پیدا کرنے کی غرض سے اس نے اسحاق موصلی کے نام سے غزلیات کا ایک خاص مجموعہ تیار کر کے گراں رقم پر فروخت کر دیا تھا۔ اور اس طرح بعض تاریخی دستاویزوں اور سکوں کو بھی تیار کر کے فروخت کر دیا کرتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات کتابیں خریدنے میں بھی مطلب کی کتابوں کے اوراق کھینچ لیا کرتے تھے۔

بعض اوقات علما بھی اپنی خاص خاص کتب کو عجیب و غریب طریق سے فروخت کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ بغداد کے کتب فروش ابن الخنزار و ابوبکر الکنتری، قاضی بغداد ابوحسن الخراسانی الصیرافی کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ جب کبھی اسے اپنی غربت کی وجہ سے کوئی ضرورت پیش آئی تو وہ اپنی بعض نایاب کتب کو اپنے تلامذہ سے نقل کروا کر بیچ دیتا تھا۔ اور ہر نقل کے اخیر میں یہ لکھ دیتا تھا۔ کہ اس نے خود اس کا مقابلہ اصل سے کر لیا ہے اور اس کی اس کے مطابق تصحیح کر دی گئی ہے۔ اس سے اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ایسا کرنے سے زیادہ رقم وصول ہو گی۔ اس مختصر کیفیت فراہمی کتب کے بعد ہمیں یہ بھی مدنظر رکھنا چاہیئے ان کو تیار کرنے کے لئے خطاط، نقاش، جلد ساز، صحاف بھی کے اسلامی فنون میں شمار ہوتے تھے جو ان کتب کو تیار کرتے تھے۔ جن کے حالات بہت ہی دلچسپ ہیں۔ سب سے بڑھ کر ان میں قرآن کریم کے لکھنے والوں نے وہ وہ اختراعات و انواع خط ایجاد کی ہیں کہ آج دنیا میں خط کی انواع ثقافت اسلامی میں خاص حیثیت رکھتی ہیں۔ اس موضوع پر ایک الگ مقالہ چاہیئے یعنی ہم دیکھتے ہیں خط کوفی، نسخ، رقاع، بدیع تعلیق، نستعلیق، شکستہ خاص کر قابل ذکر ہیں۔

رباعی :۔ ابن مقلہ وضع کرد این شش خط خط عرب — ثلث و ریحان و محقق نسخ و توقیع و رقاع
بعد از آں از خط توقیع و رقاع اہل عجم — ہفتمیں خط دگر تعلیق کردند اختراع

جو ان کتب میں استعمال ہوئے اور آج یہ گراں بہا سرمایہ ثقافت اسلامی شمار ہوتا ہے۔ اس مقالہ میں کہیں کہیں اشارہ ان خطاط کا ملے گا۔

سلاطین ایلخانی ۶۵۶ھ

ایلخانیوں کا دور ۶۵۴ھ سے ہلاکو خاں کی فتح بغداد سے شروع ہوتا ہے۔ جو منگولیا سے نکل کر ترکستان سے ہوتا ہوا بغداد تک پہنچ کر پھر وہ آذربائیجان واپس آکر مقیم ہو گیا جہاں وہ ۱۲۶۵ء تک رہا۔ اور اس خاندان کے یکے بعد دیگرے ۱۷ حکمران برسر اقتدار رہے، اور ان کا پایۂ تخت آذربائیجان تھا۔ ان کا خاتمہ ۷۵۰ھ میں ہوتا ہے۔ اس ایک صدی کے عہد میں جس قدر تباہی ہوئی اسی قدر تعمیری کارنامے ہر دو ادب و فن میں ہوئے۔ اور اس عہد کے علمی و ادبی کارناموں کو مجموعی حیثیت سے دور احیا بھی کہا ہے بلکہ اطالیہ کے عام دور احیا کے معاصر بھی ہے۔ یعنی تاریخی طور پر یہ ایک معاصرانہ میلان و رُخ تھا۔

ہلاکو خاں کے قبضہ میں خراسان، آذربائیجان، عراق، آرمینیہ، اور کچھ حصہ ایشیا کوچک کا تھا۔ ہلاکو خاں نے اپنے لئے ایل خاں کا لقب اختیار کیا جسے نائب خاں یا حاکم قبیلہ کہنا مناسب ہو گا۔

مگر ایلخانیوں کے معاصر ایران و توران و عراق کے ملحقہ علاقوں میں ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے دوران میں اتابکی، آل مظفر جلائر۔ وغیرہ حکمران تھے۔ اور ایلخانی زیادہ پیش پیش تھے۔ کیونکہ یہ فاتح شمار ہوتے تھے۔ تاہم اکثر علماء و فضلاء و صلحاء اس تمام حصہ ایران توران و عراق میں یکساں اور بجا طور پر معزز اور امام شمار ہوتے تھے۔

چنانچہ اس عہد سے متعلق مشرف الدّین بن مصلح الدّین سعدی شیرازی کا ذکر لازمی معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے زندگی کے اکثر اوقات بغداد میں گزارے۔ اور ہمیشہ سفر میں رہے

بغداد میں شیخ شہاب الدین سہروردی اور شمس الدین ابو الفرج ابن جوزی سے بہت استفادہ کیا۔ آپ کا علمی کارنامہ دو مشہور ترین اخلاقی کتابیں گلستاں اور بوستاں ہیں۔ جو قصص و حکایات پند و نصائح سے پُر ہیں جن سے شیخ کے ذاتی کردار اور اعلیٰ اخلاق کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کے حکومت سے تعلقات کوئی زیادہ خوشگوار نہ تھے۔ آپ کا وطن شیراز سے باہر رہنے کا شاید یہی ایک عذر تھا۔ سعد زنگی کا لڑکا ابوبکر بن سعد زنگی جب تخت نشین ہوا تب واپس آئے۔ اسی زمانہ میں نظم و نسق قائم ہوا۔ مدرسے اور درسگاہیں قائم ہوگئیں۔ علماء و فضلاء و شعراء دور دور سے جمع ہوگئے۔ اگرچہ حکومت سے آپ مطمئن نہیں تھے مگر دیگر امیر و اصحاب فضل و علم شیخ کی عزت کرتے تھے۔ خاص کر ہلاکو خاں کے خاندان و اولاد پر آپ کے پند و نصائح کا بہت اثر ہوا بلکہ راقم کے نزدیک اس خاندان کا دائرہ اسلام میں داخل ہونا کسی قدر شیخ سے عقیدت کا نتیجہ تھا۔ شیخ ویسے نہایت مستغنی قسم کے انسان تھے۔ جب خواجہ شمس الدین وزیر ہلاکو خاں کے حکم سے شیخ کو پچاس ہزار اشرفیاں پہنچائی گئیں تو انہوں نے ان سے ایک سرائے تعمیر کی۔ آپ کے اس طرز زندگی نے دیگر لوگوں پر بھی خاصہ اثر کیا۔ یہاں یہ بیان کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ جس طرح انسان کی یا جانوروں کی عمر متعین ہے اسی طرح کتابوں یا علمی کاوشوں کا بھی ایک عہد ہوتا ہے اور بعض کو ثبات ضرور ہے جس طرح ماشاءاللہ قرآن کریم ابتدا سے آج تک محفوظ ہے جس کی حفاظت کا دعوےٰ رب العزّت پروردگار نے خود بھی کیا ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ گلستاں، بوستاں کو ہر عہد۔ ہر ملّت، ہر قسم کے لوگوں میں ہمیشہ ہی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ بعض کا فرمانا ہے کہ جس نے ان کتب کے مندرجہ پند و نصائح پر عمل کیا۔ وہ اگر بادشاہ نہیں تو وزیر ضرور ہوگا۔ یعنی بڑے مرتبہ پر اور معزز ہوگا۔

رشید الدین فضل اللہ صاحب جامع التواریخ کا ذکر بے حد ضروری ہے۔ افسوس ہے کہ اس کی کتاب ابھی تک اپنی گوناگوں خوبیوں کے باوجود زیور طباعت سے آراستہ ہو کر ہم تک نہیں پہنچی اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لنڈن میں موجود ہے۔ اس کے مقدمہ میں سلطان خدابندہ اولجائتو سلطانیہ کا ذکر ہے جسے اس نے سلطانوں کی فہرست میں پیش کیا۔ یہ شخص ہمدان میں ۶۴۵ھ میں

پیدا ہوا تھا۔ اسی قابلیت کے بل بوتے پر اباقان کے عہد میں شاہی طبیب رہا مگر خدابندہ والجائتو کے ہاں وزیر اعظم مقرر ہوا۔ اور اسی نے سلطانیہ میں ایک بستی اپنے نام پر رشیدیہ بسائی جس میں ایک عالیشان مسجد تعمیر کی۔ جس کے ساتھ ہی مدرسہ، ہسپتال وغیرہ دیگر عمارات بھی تھیں۔ یہی شخص ہے جو بغداد میں شہاب الدین سہروردی اور جمال الدین جیسے علماء کی نجات کا باعث ہوا جب کہ ان کے خلاف بغاوت کا الزام تھا۔ اس نے اولجائتو جیسے مدبّر سلطان سے رقوم کثیر حاصل کر کے ایک اور بستی رُبعِ رشیدی کے نام سے قصبہ غازانیہ کے قریب آباد کی۔ مگر اس کی جامع التواریخ کا سہرا زیادہ تر غازان خاں کے سر ہے جس نے اسے اس کی ترتیب کے لئے ترغیب دی۔ یہ پوری کتاب ۷۱۰ھ میں ختم ہوئی۔ جس کے متعلق پروفیسر براؤن کے الفاظ ملاحظہ کرنے چاہیئے مگر راقم کے نزدیک اس کا مصوّر نسخہ جو ایڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے ۷۱۴ھ کا لکھا ہوا موجود ہے یعنے معاصرانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں وہ تصاویر ہیں جو آج اُسی عہد کی ثقافت اسلامی کے زندہ ثبوت ہیں اور ہمارے تمدّن کا معتد بہ حصّہ ہمیں ایک فاضل رشید الدین فضل اللہ کے علمی کارنامہ سے میسّر آتا ہے۔ جو اپنے زمانہ میں وزارت اعلیٰ کے عہدۂ جلیلہ تک عروج کر چکا تھا۔ اور اس کے ذریعہ ہزارہا دیگر فضلاء، ادباء، شعراء، کی سرپرستی بھی ہوئی تھی۔ اگرچہ اس کی بے شمار تالیفات ہیں مگر زیادہ اہمیت اسی جامع التواریخ کو حاصل ہے۔ اگر رشید الدّین فضل اللہ کی علمی عظمت کا اندازہ کرنا ہو تو اس کے مکتوبات سے ہو سکتا ہے۔ جو اس نے روئے عالم کے علماء اور اپنے فرزندوں کو لکھے۔ اور حسن اتفاق سے ان میں وہ بھی ہیں جو ملتان کے مولینا قطب الدین مسعود شیرازی کے نام ہیں۔ ان میں بالخصوص وہ خط جو مولانا صدر الدین محمد ترکئی کے خط کے جواب میں لکھا گیا۔ اور پھر خطرناک عدالت کے دوران میں لکھا گیا۔ اسی میں اس نے اپنے املاک اور ربع رشیدی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں جو کتب خانہ ہے وہ ہزارہا کتابوں کی جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان میں مختلف اعلیٰ خطّاطوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ایک ہزار قرآن شامل ہیں۔ جن میں دس قرآن یاقوت المستعصمی کے ہاتھ سے۔ دس ابن مقلہ اور دو سو

احمد سہروردی کے لکھے ہوئے ہیں۔ غرضیکہ رشید الدین فضل اللہ بیک وقت مدبر، طبیب، مؤرخ، عالم، ادیب، فن کار نظر آتا ہے۔ سب سے بڑھ کر وہ مجسم ہنر پرور تھا۔ یہ تمام کام اس نے علم وفضل کے فروغ کے لئے قائم کئے تھے۔ اس نے اپنی تالیفات کو عام کرنے کے لئے ان کی کئی کئی نقول تیار کرائیں۔ اور ان کے تراجم چینی، عربی اور فارسی میں بھی کرائے۔ غرضیکہ اس نے وہ کام کئے جو آج ایک پوری حکومت بھی مل کر نہیں کر سکتی۔ اس کی علم وہنر کی سرپرستی ضرب المثل ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ رشید الدین فضل اللہ کے معاصرین میں تاریخ جہاں کشا عطا ملک جوینی اور تاریخ گزیدہ حمد اللہ متوفی بھی لکھی گئیں۔ مگر جامع التواریخ کو نہیں پہنچتیں۔

رشید الدین فضل اللہ کے بعد اس کے خاندان میں بھی وہی روایات علم پروری، اور علم شناسی کی برابر قائم رہیں۔ چنانچہ اس کا لڑکا محمد غیاث الدین سلطان ابو سعید بہادر خاں کا وزیر اعظم تھا۔ اور ہم عصر مؤرخ حمد اللہ مستوفی نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ گزیدہ" اس کے نام معنون کرتے ہوئے اس کی مدح میں اس نے "وزیر نیکو نام، مثل پدر بزرگوار حسن سیرت، فرشتہ سرشت وغیرہ جیسے پُرجوش الفاظ استعمال کئے ہیں۔ بلکہ تتمہ صوان الحکمت کے فارسی ترجمہ "درۃ الاخبار" کو بھی مترجم نے جس کا نام معلوم نہیں اسی وزیر غیاث الدین محمد کے نام پر کیا۔ اور غیاث الدین محمد وزیر کا کتب خانہ بھی بہت عظیم الشان، بے مثل علمی جواہرات سے مملو تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ 'مجمع الانساب' تالیف محمد بن علی شبانکارہی بھی ان میں شامل تھی۔ جو گھر کی لوٹ میں تلف ہوگئی۔ صاحب حبیب السیر نے لکھا ہے کہ خواجہ غیاث الدین محمد سخاوت، طلاقت لسان وفصاحت بیان وحسن خلق ولطف طبع، وسلامت نفس واستقامت ذہن میں مشہور تھا۔ وہ عنفوان شباب میں حج اسلام وطواف روضہ مقدسہ خیر الانام سے مشرف ہؤا تھا۔[1]

خوشنویسوں کی فہرست میں مولانا عبد الحی منشی کا پایہ بہت بلند تصور کیا جاتا ہے خاص کر

---

[1] حبیب السیر جزاول جلد سوم ص ۱۲۳-۱۲۴

آپ خط نستعلیق لکھنے میں اپنے زمانہ کے خوشنویسوں سے افضل تھے۔ آپ مدت مدید تک سلطان سعید کے دربار کے صاحب دیوان انشار ہے۔ اور مناشیر مطاعہ کے لکھنے پر مامور رہے۔ مگر قراباغ کے واقعہ شور ۸۷۳ھ میں جس میں امیر حسن بیگ باغی ہو گیا تھا، کے بعد آپ امیر حسن بیگ کے منظور نظر ہو گئے۔ اور تاحیات سلاطین آق قونیلو کے دربار میں اسی منصب پر مقرر رہے۔

ابتدائی سلاطین ہند

ہم اسی دور میں امیر خسرو کو منصۂ شہود ہند کے اوج فلک پر دیکھتے ہیں جس میں ممکن ہے عالم فاضل و شاعر ہونے کی خوبی دوسرے سے مشترک سمجھی جائے مگر ماہر موسیقی ہونے کی حیثیت سے دوسروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ آپ کے والد ماجد امیر سیف الدین بلخ سے ہندوستان آکر آباد ہو گئے تھے۔ آپ ۶۵۱ھ میں بمقام پٹیالی پیدا ہوئے۔ جب آپ جوان ہوئے تو اسی وقت سلطان غیاث الدین بلبن ۶۶۲ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا اور آپ اس وقت تمام رسمی علوم و فنون سے فارغ ہو چکے تھے۔ بغرا خاں بن سلطان غیاث الدین بلبن سامانہ کا حاکم تھا۔ امیر خسرو ملک چھجو بار بک سے مایوس ہو کر سامانہ میں پہنچ کر شہزادہ کا ندیم بن گیا۔ انہیں ایام میں سلطان کو جب لکھنوتی بغرا خاں کو ہمراہ لے کر جانے کا اتفاق ہوا تو خسرو بھی ہمراہ گئے۔ تب بغرا خاں کو بنگال کی گورنری عنایت ہوئی۔ تو امیر خسرو نے دہلی کو ترجیح دی۔ اس لئے آپ اجازت لیکر دلی آئے۔ اسی زمانے میں سلطان بلبن کا بڑا لڑکا خان شہید یا سلطان شہید بھی وہیں موجود تھا۔ وہ نہایت قابل اور صاحب علم اور شعراء کا قدردان تھا۔ اس کے ہاں اکثر شعراء کی مجلس لگتی تھی۔ جس میں شاہنامہ، دیوان خاقانی، انوری، نظامی، کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ جن کی ایک بیاض تیار کی گئی تھی جس میں کم و بیش ہزار اشعار منتخب کر کے درج کئے گئے تھے۔ اس حسن انتخاب کی داد امیر خسرو اور میر حسن سنجری بھی دیتے تھے۔ اگر تدوین تذکرہ فارسی شعراء کی صحیح کیفیت بیان کی جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ دراصل بیاض ہی کی ایک زیادہ منظم

حبیب السیر ص ۱۹۰ ۳/۳ و ص ۲ ۳/۳

صورت تذکرہ ہے۔ اور اس کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ یہ بیاض شہزادہ کے انتقال کے بعد گھومتی ہوئی امیر خسرو کی تحویل میں آئی۔ ارباب ذوق اس کی نقلیں لیتے۔ شہزادہ جب ملتان و لاہور کا حاکم مقرر ہوا تو اس نے سب سے اوّل امیر خسرو اور حسن دہلوی کو بھی ہمراہ لیا۔ غرضیکہ یہاں پنجاب میں پھر شعراء کی مجالس گرم ہوتیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مغول نے یورش کی۔ تاتاریوں نے موقع پاکر دو ہزار کی جمعیت سے سلطان محمد پر حملہ کیا۔ جن کا شہزادہ نے خوب مقابلہ کیا۔ بقول صاحب تاریخ مبارک شاہی شہزادہ لاہور میں اسی وقت باغ نیّر یا سبز میں مقیم تھا۔ مغلوں نے رات کے وقت حملہ کرکے اس کا کام تمام کر دیا۔ اور اسی وقت تاتاریوں کے قیدیوں میں امیر خسرو اور حسن دہلوی بھی تھے۔ جن کو وہ بلخ لے گئے۔ یہ ۶۸۳ھ میں ہوا۔ ان دونوں نے سلطان شہید کا جو مرثیہ نظم و نثر میں لکھا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ دہلی میں لوگ مہینوں تک ان مرثیوں کو پڑھتے اور اپنے مقتول عزیزوں پر نوحہ کرتے تھے۔ اس کے دو سال بعد امیر تاتاریوں کے ہاتھ سے رہائی پاکر دلی آئے۔ اور بلبن کے دربار میں جاکر سلطان شہید کا مرثیہ پڑھا۔ کہرام مچ گیا۔ کسی کو کوئی ہوش نہ رہا۔ سلطان اس قدر رویا کہ بخار ہو گیا۔ آخر اسی صدمہ میں بلبن کا انتقال ۶۸۶ھ میں ہوا۔ اس کے بعد امیر خسرو نے خلجیوں کے دربار کو رونق بخشی۔ جس کی شان میں اس نے خزائن الفتوح لکھی۔ مگر خلجیوں کے آخری تاجدار قطب الدین خلجی کے نہایت افسوسناک خاتمہ کا ذکر اس نے اپنے تغلق نامہ میں ملک غازی کا دیپالپور سے نکل کر دہلی کے تخت پر بحیثیت سلطان غیاث الدین تغلق متمکن ہونا اور اسی کے ہاتھوں خسرو ملک کا عبرتناک حشر نہایت ہی دردناک لہجہ میں نظم میں بیان کیا ہے۔ اور یہ محض امیر خسرو جیسا ہی محقق شاعر چشم دید واقعات بیان کر سکتا ہے۔ غرضیکہ امیر خسرو اور حسن دہلوی کے تعلقات، ان ہر دو کی شعر و شاعری کی خدمات، سلاطین کے چشم دید حالات، علم موسیقی، زبان ملک کی خدمات، تاریخی واقعات کی صحت جو آپ نے کی ہمارا خیال ہے کہ آپ کے کارنامے دیکھ کر یہ کہنا پڑے گا کہ فی زمانہ ایک انسان سے یہ سب امور بیان ہونے ناممکن ہیں کہ اس طرح عمدگی سے عہدہ برآ ہو جائے۔ ایک بات امیر خسرو کی بین الملّی حیثیت کے

متعلق بیان کرنا لازمی ہے۔ جس سے یہ بھی واضح ہے کہ آپ کو کس طرح اہل ایران و توران نے خراج تحسین پیش کیا۔ اس کی ادنٰی مثال یہ ہے کہ سلطان حسین مرزا بالقرا، کے دربار میں جہاں تمام علماء و فضلاء، شعراء شہرہ آفاق عالم جمع تھے۔ وہاں آپ کے کلام کی اس قدر قدردانی ہوئی کہ مولانا جامی جلیسوں کی موجودگی میں سلطان کے کتب خانہ کے لئے آپ کے مجموعہ کلام یعنے خمسہ امیر خسرو کو بہزاد نے مصوّر کیا۔ اور سلطان علی مشہدی کاتب نے اسے لکھا۔ یہ تھی آپ کی قدردانی۔ آپ تغلق کے ہمراہ بنگال بھی گئے تھے۔ جب آپ کو علم ہوا کہ خواجہ نظام الدّین اولیاء نے انتقال کیا ہے آپ واویلا کرتے ہوئے دہلی پہنچے۔ وہاں پہنچ کر آپ نے خواجہ کے نام پر تمام مال و زر نثار کر دیا۔ اور خواجہ کی قبر پر تکیہ کر کے بیٹھ گئے۔ اس کے چھ ماہ بعد آپ کا انتقال ذی قعدہ ۷۲۵ھ میں ہوا۔ اور آپ کو آپ کی وصیّت کے مطابق وہیں خواجہ کے احاطہ ہی میں دفن کیا گیا۔

امیر خسرو کی یہ مختصر کیفیت درج کرنے کے بعد ہم محض اسی قدر کہنا چاہتے ہیں کہ امیر خسرو کا تمام کارنامہ زندگی دراصل سلطان بلبن کے عہد سے شروع ہو کر عہد تغلق تک اس قدر وسیع اور تاریخی اوجان نجان کا حامل ہے کہ انسان ذرا سوچے تو حیران رہ جاتا ہے اور پھر محض ایک ہی شخص نے کس طرح اس تمام عہد کی تاریخی کیفیت و ثقافت کے ماحول کو پیش کیا ہے۔ یہ سب کچھ علم و ہنر کے سرپرست سلاطین کی وجہ سے ہے۔ ورنہ آج کچھ بھی نہ ہوتا۔ آپ کا ہر ایک علمی کارنامہ بذاتِ خود ایک ذخیرۂ معلومات وقت سے لبریز ہے۔ ان سلاطین کے دربار میں امیر خسرو اس قدر مطمئن اور قانع نظر آتا ہے کہ بذاتِ خود ایک دعوتِ عمل ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے الدرر الکامنہ میں سلطان محمد تغلق کے ذکر کے تحت لکھا ہے کہ اس کے دربار میں ایک شخص شفا ابن سینا کا ایک قلمی نسخہ یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا لایا۔ تو محض ہنر پروری کی خاطر اس نسخہ کو اس سے ایک ہزار مثقال کے عوض میں حاصل کر لیا۔ اور ہدایا مشہور کتاب فقہ حنفی کی اسے زبانی یاد تھی۔[1] اسی طرح ضیاء الدین برنی نے بھی اپنی تاریخ فیروز شاہی

---

[1] الدررالکامنہ۔

میں واقعات لکھے ہیں۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد کے مؤرخین نے لکھا ہے کہ سلطان کو تراجم غیر اسلامی کتب کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ جب وہ ۷۷۲ھ میں نگرکوٹ کے بت خانہ جوالا مکھی کے نام سے مشہور تھا کی سیر کو گیا تو اسے معلوم ہوا کہ یہاں کے کتب خانہ میں ۱۳ سو سنسکرت کی قدیم تصنیفات موجود ہیں۔ اس نے ان میں سے دو کے ترجمہ کا اہتمام کیا۔ نجوم کی ایک کتاب کا ترجمہ عزالدین خالد خانی جو شعراء و منشیان عصر فیروزی میں ممتاز تھا، فارسی نظم میں کیا۔ اور دلائل فیروزی نام رکھا۔ یہ کتابیں اکثر علم پنگل یعنی موسیقی اور فن کشتی میں تھیں۔ ملّا عبدالقادر بدایونی نے اپنی منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ ۱۰۰۰ھ میں جب میں لاہور پہنچا تو یہ ترجمہ شدہ کتابیں میری نظر سے گزریں[۱]۔ محمد تغلق کے عہد کا صحیح مرقع ابن بطوطہ کے سفرنامہ اور قصائد بدر چاچ کے مطالعہ سے

لاہور کے اہل علم و فضل (ابتدائی دور)

۴۱۲ھ میں سلطان محمود غزنوی کی فتح لاہور سے اسلامی سلطنت کا یہاں آغاز ہوتے ہی اسلامی علوم و فنون کی طرف توجہ ہو گئی تھی جب کہ یہاں سلطان نے خود مساجد اور منارہ تعمیر کئے[۱]۔ جہاں علمائے کرام کا وجود اور قیام لازمی تھا۔ بلکہ ایک طرح اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ اس فتح سے پیشتر علماء و مبلّغین یہاں آ چکے تھے تو ممکن ہے۔ کیونکہ شیخ اسمٰعیل بخاریؒ[۲] کے تذکرہ میں ملتا ہے کہ آپ نے قریب پچاس سال حدیث و تفسیر پڑھائی اور تبلیغ اسلام کر کے یہاں ۴۴۸ھ میں انتقال کیا۔ آپ کا مزار لاہور میں ہال روڈ پر ہے۔ اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو تو علما و فضلا کی جماعت کا وجود یہاں ۴۱۲ھ فتح محمود غزنوی سے پیشتر ماننا پڑے گا۔ بلکہ مہروزی نے اپنی کتاب حدود العالم میں جو قریب ۳۵۰ھ میں تالیف ہوئی لاہور قدیم کا ذکر کیا ہے[۳]۔ جس کے مطالعہ سے بھی ہم اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ بہر حال اس سلسلہ درس تدریس اور تبلیغ اسلام کو برقرار رکھنے کے لئے یہاں حضرت علی مخدوم ہجویری الجلالی المشہور بہ داتا گنج بخش[۴] تشریف لائے۔ آپ کی تصوّف میں مشہور کتاب "کشف المحجوب" ہے۔ یہیں آپ کا انتقال ۴۶۵ھ میں ہوا۔ اور آج آپ کا مزار لاہور میں بھاٹی دروازہ کے باہر ایک عام مرجع خلائق

ہے۔[۱] مگر سمعانی نے اپنی کتاب الانساب[۵] میں لکھا ہے کہ ایک جماعت علماء کی یہاں موجود تھی۔ جن میں ابوالحسن بن عمر بن الحکم الاہوری تھے۔ وہ جیّد عالم، محدّث، ادیب و شاعر تھے۔ جنھوں نے ابو علی المظفر بن الیاس بن سعید العیدی سے علم حدیث حاصل کیا تھا۔ ابو الفرج عبدالصمد بن عبدالرحمٰن الاشعثی الاہوری جن کا انتقال یہاں ۵۲۹ھ میں ہوا۔

سمعانی نے بیان کیا ہے کہ ہر سے دادا ابی المظفر سمعانی نے ابوالقاسم محمود خلف لاہوری سے علم فقہ میں مناظرہ کیا تھا۔ اور میں نے آپ سے اسفرائن میں ملاقات کی۔ اور حدیث سُنی جبکہ وہ وہاں مقیم تھے۔ آپ کا انتقال ۵۴۰ھ کے حدود میں ہوا۔ ابتدائی شعرا فارسی میں مسعود سعد سلمان اور ابوالفرج عہد غزنوی میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے یہاں اپنے نہایت عالیشان مکانات تعمیر کئے جن کا ذکر ان کے اشعار میں بھی ملتا ہے۔ اور دنیا سے اپنی شاعری میں خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ سب سے بڑھ کر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ مشہور صاحب "مشارق الانوار" حضرت امام شیخ العالم رضی الدین ابوالفضائل الحسن بن محمد بن حیدر بن علی بن اسمٰعیل القرشی الصّغانی لاہور میں چھٹی صدی ہجری میں ۵۷۷ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اور یہیں آپ نشوونما پانے کے بعد دوسرے ممالک میں برائے سیاحت چلے گئے۔ ۶۲۴ھ میں ہندوستان براستہ دیبل (کراچی) بعہد سلطان شمس الدین التمتش خلیفہ عباسی کی بھیجی ہوئی سفارت پر تشریف لائے۔ جو راجپوتانہ، اجمیر سے ہوتے دہلی وارد ہوئے۔ جس کا ذکر معاصر کتب میں ملتا ہے۔ آپ کا انتقال ۶۵۰ھ میں بغداد میں ہوا۔ مگر آپ کی وصیّت کے مطابق مکہ معظمہ میں دفن کیا گیا[۶]۔ سیر العارفین کے مصنّف جمالی نے بیان کیا ہے۔ کہ جب حضرت خواجہ معین الدین حسن سنجری چشتیؒ وسط ایشیا سے ہندوستان تشریف لائے تو آپ یہیں لاہور سے گذر کر دہلی پہنچے۔ اور اس وقت آپ نے حضرت شیخ حسین زنجانی (میراں شاہ چاہ میراں) سے لاہور میں ملاقات کی۔ صدر الدین محمد بن حسن نظامی نے اپنی کتاب "تاج المآثر" میں بیان کیا ہے جو دراصل قطب الدین ایبک کے عہد میں یہیں لاہور میں لکھی گئی ہے۔ کہ یہاں وہ وہ اعلیٰ پایہ ہستیاں علوم و فنون میں سرشار تھیں۔ کہ کسی اور مقام کو یہ شرف حاصل نہیں تھا۔ اور یہاں کے لوگوں کا مسلک حنفی تھا۔ یہ سب کچھ ایک ہی جذبہ کے ماتحت تھا کہ علم ہی دنیا میں لازوال متاع ہے۔

مولانا رومؒ کا زمانہ

اگر ساتویں صدی ہجری کا نصف آخر اور آٹھویں صدی کے ربع اوّل کے زمانہ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اس زمانہ میں تمام دنیائے اسلام پر ایک خاص قسم کا ماحول جاری اور ساری تھا جو عام طور پر تصوّف سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں امیر خسرو (۷۲۵ھ) کی کلیات جن کا روحانی تعلق حضرت نظام الدین اولیا جیسوی سے تھا، عراق میں شیخ سعدی متوفی سنہ ۶۹۱ھ کی گلستاں و بوستاں اور مشرق ادنٰے میں مولانا جلال الدین رومی (۶۷۲ھ) کی مثنوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اگر ان تینوں معاصر ہستیوں کے پس منظر کا مطالعہ کیا جائے تو بہت ہی دل چسپ حالات کا انکشاف ہوگا۔ جو زیادہ تر ان بزرگان کے حسن سلوک کے ذاتی رجحان طبیعت اور علمی شغف اور دنیاوی جاہ و جلال سے بے نیازی کا نتیجہ نظر آئیگا بلکہ ان کا یہ ذاتی جوہر اپنے ماحول میں حکومتوں اور عوام میں ایک رابطہ مفاہمت قائم رکھنے میں بہت حد تک ممد رہا۔ یعنی عراق و عجم میں ایلخانیوں اور مشرق ادنٰے میں سلاجقہ کی علم و ہنر کی قدردانیاں، ادھر ہندوستان میں سلاطین بلبن کے عہد سے لیکر خلجیوں اور تغلقوں کے درباروں میں اہل علم و فن کی سرپرستی و قدر و منزلت کی رو سے آپس میں ایک مستقل کڑی میں منسلک نظر آتے ہیں۔ بلکہ یوں کہیئے کہ عالم اسلام میں ایک باہمی رابطہ عمل پیرا رہا ہے۔ علم التواریخ کے اصول پر ایک ہم آہنگ خیالات کا رُخ یا میلان ایک ہی نہج پر حرکت کرتا معلوم ہوگا۔ مولانا رومؒ کے والد ماجد شیخ بہاء الدین بلخ میں مقیم تھے۔ آپ کا رشتہ ناطہ خوارزمشاہیوں سے تھا۔ آپ کی اپنے آبائی وطن بلخ سے نکل کر روم تک پہنچنے کی عجیب و غریب داستان ہے۔ کہ کس قدر آپ اپنے علم و زہد و تقویٰ کے باعث عوام میں مقبول اور سلاطین میں معزز تھے۔ آپ سے نیشاپور میں خواجہ عطار ملنے کو آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مولانا جلال الدین کی عمر ابھی چھ سال تھی۔ یہاں سے نکل کر آپ بغداد پہنچے جہاں مدتوں درس تدریس میں مشغول رہے۔ جس میں تمام طلبہ، علما، فضلاء عراق شریک ہوتے۔ اور رؤسا، امرا، علما ملاقات کو آتے۔ یہاں سے آپ نکل کر قونیہ (روم) روانہ ہوئے جس کی اطلاع آپ نے سلطان کیقباد

سلجوقی کو پہلے کردی تھی۔ چنانچہ اس نے اطلاع پاتے ہی تمام ارکان دولت سے آپکا خیر مقدم کیا۔ اور ایک عالیشان مکان میں اتارا جہاں آپ کا انتقال ۶۲۸ھ میں ہوا۔ جب کہ مولانا جلال الدین رومی کی عمر قریب چوبیس سال تھی۔ غرضیکہ یہ ماحول یا پس منظر تھا جس کو مولانا قونیہ لے کر پہنچے تھے۔ جس کے بعد آپ نے وہاں پہنچ کر اپنی شہرۂ آفاق تصنیف مثنوی کو مکمل کیا۔ جب ابن بطوطہ قونیہ پہنچا تو مولانا کی قبر کی زیارت کی اور آپ کی مثنوی اپنی خوبیوں کی وجہ سے عوام کے زبان زد تھی۔

"ہست قرآں در زبان پہلوی"

کے لقب سے یاد کی جاتی ہے۔ یہ ایک اعزاز، اقرار و اعتراف علم کی دنیا میں ایک انتہائی معراج ہے جس کے سامنے سب قسم کا دنیاوی وقار ہیچ ہے۔ جب تک دنیا قائم ہے اِن متذکرہ بالا ہستیوں کے علمی کارنامے ہمیشہ درخشاں ستاروں کی طرح چمکتے رہیں گے۔ اور لوگوں کو راہ ہدایت کی تلقین کرتے رہیں گے۔

سلاطینِ تیموریہ

عام طور پر امیر تیمور (متوفی ۸۰۵ھ) کو ظالم، غاصب اور وحشی بیان کیا جاتا ہے مگر جب ہم اس کے زمانے کے علوم و فنون کی سرپرستی اور فن کاروں سے حسن سلوک کے قصّے سُنتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں اور باور نہیں کرتے کہ وہ واقعی ظالم تھا، بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظالم تیمور کوئی اور ہی شخص تھا۔ اس کے حالات میں یہ بہت کچھ لکھا ہے کہ اس نے جب بھی کسی اہل ہُنر و علم کو دیکھا اس کی حفاظت ہی نہیں کی بلکہ پوری سرپرستی کی۔ ملک شام میں جب ابن خلدون اس کی فتح کے بعد زیر حراست ہوا جس کی پوری کیفیت ابن خلدون نے خود اپنی مشہور تاریخ میں تحریر کی ہے تو یہ ملاقات دمشق میں مدرسہ عادلیہ میں ہوئی جسے ابن خلدون نے خود لکھا ہے کہ یوں تو پوری طرح امن و عافیت کی زندگی بسر ہو رہی تھی دفعتہً تیموری لشکر نے مصر پر حملہ کیا تو سلطان ملک الظاہر میدان جنگ میں شکست کھا کر بھاگا۔[1] اور علامہ ابن خلدون بھی بھاگتے بھاگتے تیموری سپاہیوں کے ہاتھ آ گئے۔ جب آپ کو تیمور کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ کا عجیب و غریب لباس دیکھ کر زیادہ توجہ کی۔ ان کو فوراً امان دی گئی بلکہ آزاد کر کے

---

[1] منتخب التواریخ بدایونی ج

کتاب کے مکمل کرنے کے لئے سہولتیں مہیا کیں۔ جسے ابن خلدون نے خود تحریر کیا ہے۔ اگر تیمور ابن خلدون کے ساتھ ظالمانہ سلوک کرتا تو آج یہ کتاب بھی میسر نہ آتی۔ یہ سب تیمور کی ذاتی سرپرستی سے ہوا۔ جب اصفہان سے واپس ہوا تو وہ اپنے ہمراہ ایک معمار محمد بن محمود اصفہانی کو لایا جس سے اس نے ایک روضہ اپنی بیوی بی بی خانم کے لئے تعمیر کرایا۔[1] جب وہ مکمل ہوا تو اُسے گراں بہا انعام واکرام عطا کئے۔ اور تیمور اس قدر محظوظ ہوا کہ اس کے نام کو روضہ کے دروازے پر کندہ کروادیا جو آج تک نہایت اعلیٰ قسم کی کاشی کاری کے نقش و نگار میں خط ثلث میں موجود ہے۔ اس کے بعد جب اس کا اپنا انتقال ہوا تو وہ بھی اسی میں دفن کیا گیا جس کی وجہ سے آج یہ روضہ "گور امیر" کے نام سے مشہور ہے۔ اور یہ عمارت فنی اعتبار سے مسلّم الثبوت نمونہ فن تعمیر ہے جس کے اصولوں پر تاج محل تعمیر ہوا۔ یعنی تاج کا شلغمی دُہرا گنبد مع نیچے سردانہ برائے اصل قبر جو شاہی زنانہ قبور کے لئے مغلوں میں ایک خصوصیت ہو گیا۔ اغلباً بوقت تعمیر تاج کے معماروں نے گور امیر کو مدّنظر رکھا۔ اسی طرح جب تیمور ہندوستان آیا تو آپ نے یہی سلوک شیخ احمد کھاٹو کے ساتھ کیا۔ شیخ احمد کھاٹو کے ذکر میں ہم تحفۃ المجالس[2] کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ آپ جب حج سے ہندوستان واپس ہوئے تو دہلی میں خان جہاں کی مسجد میں پھر مقیم ہو گئے۔ اور تیمور کے حملہ کے وقت ۸۰۰ھ میں وہاں موجود تھے۔ اس وقت دہلی میں محمود بن محمد بن فیروز شاہ تغلق شاہ شطرنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور مرکزی حکومت کمزور ہو چکی تھی۔ جب شیخ احمد کھاٹو کو تیمور کی آمد کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اپنے حلقہ کے آدمیوں کو دہلی چھوڑنے کی ہدایت کی۔ ان میں شیخ صدو بھی شامل تھے۔ جو خاندان تغلق کے داماد تھے وہ میرٹھ چلے گئے جہاں لوگوں نے آپ کا خیر مقدم کیا۔ تیمور نے جب دہلی فتح کر لی تو مخلوق کی گرفتاری میں اس کا لشکر مشغول ہو گیا۔ چنانچہ قیدیوں میں خود شیخ احمد کھاٹو بھی تھے۔ کچھ دن قیدیوں کے ہمراہ رہے جب تیمور کو علم ہوا تو دربار میں آپ سے ملاقات کی اور بہت خوش ہوا۔ آپ کو آزاد کر کے خلعت سے سرفراز کیا۔ اپنے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھلایا پھر فرمایا کہ شیخ جس کی سفارش

---

[1] مساجد سمرقند مطبوعہ سمرقند گورنمنٹ ماسکو روس، ص ۱۸۹۵ء

[2] تحفۃ المجالس مؤلفہ محمود بن سعد ایرجی ترجمہ ابوظفر ندوی اعظم گڈھ ۱۹۳۳ء ص ۱۵-۱۶

کریں ان کو آزاد کر دو۔ شیخ نے بڑی دریا دلی سے اپنے تمام حلقہ کے لوگوں کو رہا کر وایا۔

بابا اسحٰق مغربی پیر و مرشد شیخ احمد کھٹو کے متعلق اس قدر بیان کرنا ضروری ہے کہ آپ شیخ کبیمی مغربیؒ کے مرید اور سلسلہ مغربیہ کے بہت بڑے رکن تھے۔ بقول صاحب گلزار[1] ابرار سلطان محمد تغلق آپ کی بہت تعظیم و تکریم کرتا تھا۔ آپ اجمیر میں خواجہ معین الدین کے دربار میں پہنچے۔ وہاں سے آپ موضع کھٹو میں آکر مقیم ہو گئے۔

اس کے عہد کے واقعات کو ملّا شرف الدین علی یزدی نے ظفر نامہ میں مفصل بیان کر دیا ہے جو بذاتِ خود علماء سے تیمور کے حوصلہ افزا سلوک کی دلیل ہے۔

تیمور کے بعد اس کا لڑکا مرزا شاہ رخ تخت نشین ہوا جس کا سب سے اوّل کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنا پایہ تخت سمرقند سے ہرات تبدیل کیا۔ جس سے وہ ایران و توران و ہند کے مراکز کے قریب ہو گیا۔ جس کی وجہ سے تیموری دور میں ایک خوشگوار تبدیلی ہوئی۔ ان نے ۸۵۰ھ میں ۴۳ سال حکومت کر کے ۷۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس نے خاص کر فن تعمیر کو بہت فروغ دیا۔ اس کی تعمیرات مرو اور ہرات میں قابل دید ہیں مگر اس کا سب سے بڑا کارنامہ باپ کی تاخت و تاراج کی تلافی، رعایا کے حالات سے واقفیت حاصل کرنا، اور ان کی خوش حالی کی تدبیر کرنا ہے۔ یعنی اس نے اہل ہنر و فضل کے ساتھ رحم و سلوک و غمخواری کا برتاؤ کیا۔ علمی یادگاروں کے ضمن میں مطلع السعدین قابل ذکر ہے۔ جس کا مصنف عبدالرزاق ہندوستان میں سلطنت وجیانگر میں سفیر مقرر ہو کر آیا اور اس نے اپنے چشم دید حالات کو قلمبند کیا ہے۔ اس ضمن میں تیموری سلاطین و شہزادگان کا ذکر کرنا ناگزیر ہے۔ جن کی سرپرستی سے وہ علمی و فنی کارنامے ظہور میں آئے کہ آج دنیا میں اس کا ثانی ملنا ناممکن ہے۔ خاص کر تیموری شہزادگان میں سے بائسنغر مرزا ابن شاہ رخ جب استرآباد میں گورنر تھا تو اس نے نوجوانی کے عالم میں ۳۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔ یہ وہ شخص ہے جس نے ایرانی کتاب سازی کی ایک خاص نہایت نفیس طرز کی بنا رکھی۔ جو آج تک اسی سے منسوب ہے۔ اسی کے زیر اہتمام مولانا

---

[1] گلزار ابرار۔ غوثی

جعفر تبریزی مشہور خطاط نے تربیت پائی - جو عبداللہ بن میر علی تبریزی موجد طرز نستعلیق کا تلمذ تھا - اس کا لکھا ہوا ایک شاہ نامہ فردوسی کا مصور نایاب نسخہ آج تک ایران کے کتب خانہ ملی میں موجود ہے جس کی برجستہ طلا پوش جلد سر فصل و سر صفحہ مذہب مرصع مع ۲۲ تصاویر کے قابل دید ہے۔ اس کے ترقیمہ میں مولانا جعفر نے فخریہ لکھا ہے " قد وقع الفراغ من تحریر ہذا الکتاب الشریف ـــــ باشارۃ الخان سلطان ..... بائسنغر بہادر خلد اللہ ـــــ علی یہ العبد الضعیف ..... جعفر البائسنغری اصلح اللہ احوالہ .... سنہ ثلاث وثلاثین وثمان مایۃ -

مولانا مرز جعفر کا انتقال ۷۵ سال کی عمر میں شہر ہرات میں ۸۸۵ھ میں ہوا[1]

حسن اتفاق سے خواجہ میر علی تبریزی کے ابتدائی نستعلیق خط کا نمونہ آج بصورت مصور نسخہ کلیات خواجو کرمانی برٹش میوزیم میں موجود ہے جسے اس نے ۷۹۸ھ میں بہرام اقتدار کے لئے لکھا تھا - اور اس کی تصاویر جو فن ایرانی مصوری کا بہترین نمونہ جنید نقاش سلطانی کی بنائی ہوئی ہیں[2]۔

بائسنغر مرزا کے دربار سے بہت ہی باکمال حضرات منسلک رہے - مولانا جعفر کا تلمیذ مولانا اظہر قابل ذکر ہے جس نے ایک سلسلہ ماہری طرز نستعلیق کا اجرا کیا - اسی عہد میں اسلامی نقش و نگار نے ایک خاص حیثیت اختیار کی جو کتابوں کی تیاری کی حد تک محدود نہ تھی - غرضیکہ یہ سب تیموری شہزادگان مجسم ایک پکچر گیلری کے مانند نظر آتے ہیں - جہاں بہترین فن کے نمونے اور فن کے نمونوں کو تیار کرنے والے سب کے علاوہ ان ہنروروں کے ہنر پرور و ہنر شناس پہلو بہ پہلو بغیر کسی تمیز کے کھڑے ہیں -

تیموری سلاطین کی فہرست میں سلطان حسین بن منصور بن بائقرا، فن ادب اور علم و فضل کے فروغ میں ایک درخشاں ستارہ نظر آتا ہے - جو ایران و توران کے آسمان پر طلوع ہوا - اس نے سلطان ابو سعید کی وفات کے بعد ہرات کو مسخر کیا اور وہاں اس کی ۱۰ رمضان ۸۷۲ھ کو رسم تخت نشینی ادا کی گئی - اور اس کی وفات ۱۱ ذی الحجہ ۹۱۱ھ کو ہوئی جب کہ اس کی عمر

---

[1] نمونہ خطوط خوش کتاب خانہ شاہنشاہی ایران از مہدی بیانی ص ۱۶۳ - [2] فہرست مخطوطات برٹش میوزیم ابو ص ۶۲

۱؎ سال تھی وہ خود شاعر تھا جس کے ثبوت میں عام طور پر اس کی تالیف "مجالس العشاق" پیش کی جاتی ہے جس کے نسخے اکثر ملتے ہیں اور طبع بھی ہو چکی ہے۔ اگرچہ بعض کا خیال ہے کہ وہ کمال الدین حسین گازر گاہی کی تصنیف ہے۔ بہر حال یہ مسلّمہ امر ہے کہ وہ خود فارسی، عربی اور ترکی کا بلند پایہ شاعر تھا۔ اس کی اکثر غزلیں لوگوں کے زبان زد تھیں۔ اس کا قابل وزیر کل میر علی نوائی جو نہ صرف اپنے آقا کی طرح ادبا و فضلاء کا مربی ہی تھا بلکہ نظم و نثر دونوں میں خود فارسی و ترکی زبان کا بہت اعلیٰ پایہ کا مصنّف و شاعر تھا۔ یہ دونوں سلطان و وزیر اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ اس عہد میں وہ وہ باکمال اصحاب فن و ہنر و ادیب منصّہ شہود پر آئے کہ ان کے کمالات کو کماحقہ بیان کرنے کے لئے قلم و دماغ عاجز ہیں۔ مصوّروں میں استاد کمال الدین بہزاد، خطّاطوں میں قبلۃ الکتّاب مولانا سلطان علی مشہدی، شعرا میں مولنا عبدالرحمٰن جامی وغیرہ کے نام گنوا دینا کافی ہے۔ اس عہد میں مولانا نجم الدین الطارمی کا ذکر نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ آپ فن انشاء علم املا میں بے امثل زمانہ تھے۔ آپ مرزا میران شاہ کی ملازمت میں تھے۔ آپ نے اس شہزادہ کے فرمانے پر کل کامل ابن اثیر کا ترجمہ عربی سے فارسی میں کیا۔ اور اس میں وہی فصاحت و بلاغت کو قائم رکھا۔[۱] ان اصحاب کمال نے وہ کارنامے چھوڑے ہیں کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ اس کے لئے یہاں ڈاکٹر مارٹن کے الفاظ نقل کر دینا کافی ہیں جو اس نے ایرانی مصوّری کے تحت لکھے ہیں:

> "حقیقت یہ ہے کہ ایران میں نفیس ترین قالین شاہ عباس کے زمانہ میں بھی نہیں بلکہ تیمور ہی کے زمانہ میں بنے ہیں۔ عمدہ ترین اسلحہ اور زرہیں، اور ہاتھی دانت کا کام جس کی باریکی تمام دوسرے ممالک کے نمونوں سے بڑھ کر ہے۔ سب ان کے دربار کی پیداوار ہے۔ ایرانی صنعت کے تمام نمونوں کا مبداء و منبع جن میں اعلیٰ ترین مذاق اور کاریگری آشکار ہے تیموریوں کا زمانہ صفوی کے آغاز

۱؎ حبیب السیر ص 41 ۳/۳

کا سہرا ہے۔ مشرق کی تمام صناعانہ پیداوار براہ راست بادشاہ کی طرف سے شوق دلانے کا ثمرہ رہے۔ اگر بایسنغر مرزا اور سلطان حسین مرزا نہ ہوتے تو ہم ان کے پروردہ باکمالوں کی دلپذیر مرقع کشی سے محروم رہ جاتے۔ کیونکہ خود ان کی اپنی تصانیف تھیں۔ جن کی آرائش و تنقیش کے لئے وہ اپنی سلطنت کے گوشے گوشے سے مصوروں کی اتنی آؤ بھگت کرتے تھے کہ اگر شاہ عباس نہ ہوتے تو ہمارے پاس خوشنما نقش و نگار کی مخمل نہ ہوتی۔ اور سلیمان عظیم الشان نہ آتا تو آج ہم ازنیق کی چینی ظروف سازی نہ دیکھتے۔ سلطان احمد پیدا نہ ہوتا تو قرآن کے بے نظیر اور نظر نواز نسخے نہ ہوتے۔ جن کے دم سے آج بھی ان لوگوں کے ذوق جمال کو بقا حاصل ہے۔ مشرق کی کل حقیقی صنّاعی درباری صناعی ہے یا ہنر پرور مربیوّں کی تربیت پر موقوف رہی ہے۔ نویں صدی عیسوی میں بغداد کے عباسی دربار پر اس کا دارومدار رہا۔ مصر اور اسپین میں ہر جگہ یہی کچھ نظر آتا ہے۔ اسی حقیقت کو ذہن میں رکھنا ناگزیر ہے کہ کیونکہ اس سے بہت سی ایسی باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں جو اس کے بغیر ناقابل فہم ہیں۔ یہ اندازہ کرنا ایسی روشن صناعی تاجدار کے معدوم ہونے کے ساتھ مٹ جاتی ہوگی غلط ہے وہ بادشاہ نہ رہے لیکن باکمال اپنے فن کے نمونوں کی وجہ سے زندہ رہے۔ انہوں نے اورکا دامن پکڑا۔ تیمور کا پیدا کیا ہوا شوق ایک طاقت تھی اور یہی جذبہ سولہویں صدی کے آخر تک ایران کے لئے قائم رہا۔ تیموریوں کے بعد فرمانرواؤں یعنی صفویوں ہی پر موقوف نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے تاجداروں نے جن کے نام ہی تاریخ میں قریب قریب نامعلوم ہیں انہوں نے ان طریقوں اور رواجوں کو جاری رکھا۔ اور ایسے ایسے گراں بہا نسخے کتابوں کے تیار کراتے رہے کہ یورپ والوں نے خواب و خیال میں بھی پیدا نہیں کئے۔"

قرونِ وسطیٰ کی دانشگاہیں (یونیورسٹیاں) ہندوستان

ہندوستان کے اطراف واکناف میں ابتدا سے ہی اسلامی عہد میں فتوحات کے ساتھ ساتھ علوم وفنون کے فروغ کی طرف فوراً توجہ ہوئی۔ طبقات ناصری کے حوالہ سے مدرسہ فیروزی مقام اُچہ کا واضح طور پر حوالہ ملتا ہے کہ جہاں خود صاحب طبقات ناصری مولانا منہاج سراج آکر ۶۲۴ھ میں منتظم ومعلم ہوا تھا۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اس کے پیشتر ہی مدارس اور مقامات پر بھی موجود تھے۔ اسی طرح فرشتہ نے حضرت شیخ بہاؤالدین ذکریا ملتانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مولانا قطب الدین کاشانی جب ماوراء النہر سے ملتان تشریف لائے تو آپ کو ناصر الدین قباچہ والی ملتان نے آپ کے آنے پر مدرسہ اور سرائے تیار کروا کر وہاں آپ کو درس تدریس کے لئے تجویز فرمایا۔ سلاطین ملتان میں سے حسین لنگا کا ذکر بہت دلچسپ ہے جس نے عنان حکومت ملتان کو ۸۷۴ھ میں سنبھالا تو اس نے قاضی محمد کو احمد آباد گجرات مظفر شاہ گجراتی کے پاس تحائف وہدایا دے کر ارسال کیا تاکہ وہ وہاں کے شاہان گجرات کی عمارات کو دیکھ کر واپسی پر ان کو بیان کر سکے۔ چنانچہ جب وہ واپس آیا تو اس نے حسین لنگا کی خدمت میں مشاہدات بیان کئے کہ احقر کی زبان وہاں کے سلاطین کے منازل دلپذیر کی توصیف میں بند ہے۔ ہاں اگر ایک سال کے لئے تمام مملکت ملتان کا محصول قصر کی تعمیر میں خرچ کر دیا جائے تو شاید انجام پا جائے سلطان حسین لنگا نہایت غمگین ہوا۔ عماد الدین تولک وزیر نے یہ معاملہ دیکھ کر جرأت سے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حوادث زمانہ سے محفوظ رکھے۔ وجہ دریافت کی بادشاہ نے جواب دیا کہ اللہ نے مجھ پر لفظ شاہی کا اطلاق ضرور کیا ہے مگر معنی شاہی سے محروم ہوں۔ جس پر وزیر نے پھر عرض کی کہ اللہ تعالےٰ نے ہر ایک مملکت کو ایک نہ ایک فضیلت سے مخصوص کیا ہے۔ جس وجہ سے وہ مملکت دوسرے ممالک میں عزیز اور محترم ہے۔ اور ممالک گجرات، دکن، مالوہ اور بنگالہ اگرچہ زرخیز ہیں۔ اور تمام سامان عیش وطرب مہیا ہے۔ لیکن مملکت ملتان مردم خیز ہے۔ کیونکہ ملتان کے بزرگان جہاں بھی گئے معزز ومحترم ہوئے۔ شکر ہے کہ شیخ الاسلام شیخ بہاؤالدین

---

(۱) تاریخ فرشتہ

قدس سرہٗ کے طبقہ علیہ کے چند بزرگ ملتان میں موجود ہیں جیسا کہ شیخ یوسف قریشی جن کے فرزند کو سلطان بہلول نے اپنی دختر بیاہ دی تھی۔ ان کی عزت کرتے تھے، ترجیح رکھتے ہیں۔ اور طبقہ بخاریہ سے ابھی چند اشخاص ملتان میں موجود ہیں جو ظاہر اور باطن میں حاجی عبدالوہاب پر شرف رکھتے ہیں۔ اور طبقہ علماء میں سے مولانا فتح اللہ اور ان کے شاگرد مولانا عزیز اللہ خاک ملتان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اکثر اہل ہندوستان ان علمائے ملتان کی وجہ سے فخر کرتے ہیں جو بالکل بجا ہے[1] مالوہ بمقام مانڈو جو مالوہ کے خلجی سلاطین کا پایۂ سلطنت تھا۔ آج یہ مقام باز بہادر اور روپ متی کی وجہ سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کے بالکل قریب میں ظفر آباد تغلق کا مدرسہ قابل ذکر ہے مگر اس سے قریب میں ہی سلطان ہوشنگ غوری (۸۳۸ھ) نے ایک مدرسہ وہاں شادی آباد میں قائم کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ہوشنگ غوری اپنے مدرسہ میں دفن کیا گیا تھا۔ بنگال جو قریب قریب دہلی کی فتح کے ساتھ ہی بختیار خلجی کے ہاتھوں ۵۹۳ھ میں فتح ہوا تھا۔ جس نے شہر ندیا کے مقام پر رنگ پور نامی شہر آباد کیا۔ وہاں محلات و مدرسے اور خانقاہیں و مساجد تعمیر کرائے[2]۔ جونپور جہاں مشرقی سلاطین کے نام الگ سلطنت نویں صدی ہجری میں قائم ہو گئی تھی۔ وہاں ظفر آباد اور مسجد بذات خود مدارس تھے۔ سلاطین جونپور میں مدارس کے وجود کے علاوہ وہاں کے قاضی ملک العلما شہاب الدین دولت آبادی کا ذکر خاص کر کرنا چاہیئے کہ آپ دراصل غزنی کے باشندے تھے۔ اور دولت آباد دکن میں آکر مقیم ہو گئے تھے۔ جہاں آپ نے نشو ونما پائی تھی۔ سلطان ابراہیم شرقی جونپوری (۸۴۰ھ) آپ کی عزت کرتا تھا۔ آپ نے کافیہ کا حاشیہ مقامی ہندی زبان میں لکھا تھا۔ اور مصباح کے متن کو تیار کیا۔ (۳)، و متن ارشاد نحو میں جو صلح الامثال کہلاتی ہے اور بدیع البیان و فتاویٰ ابراہیم شاہی و تفسیر فارسی بحر المواج تصانیف ہیں۔

دہلی میں علوم

دہلی کی فتح قطب الدین ایبک کے ہاتھوں ۵۸۷ھ میں ہو گئی تھی۔ جس نے فوراً اس

---

[1] تاریخ فرشتہ ۲/۳۲۱-۳۲۷ لکھنؤ [2] فرشتہ ۲/۲۹۱ [3] فرشتہ ۲/۳۰۶ وہ و متن ارشاد نحو میں جو صلح الامثال کہلاتی ہے اور بدیع البیان و فتاویٰ ابراہیم شاہی و تفسیر فارسی بحر المواج تصانیف ہیں۔

فتح کے اعلان کے لئے اس نے وہاں مسجد بنام قوۃ الاسلام کی بنا رکھی تھی یہ ابتدائے مدارس تھی مگر یہاں مدرسہ میں بعہد سلطانہ رضیہ سنہ ۶۳۵ھ میں ۔۔۔۔۔ طبقات ناصری کے مصنف منہاج سراج کو گوالیار سے بلا کر مقرر کیا گیا۔ اسی طرح سلطان علاء الدین خلجی نے بھی مدرسہ قائم رکھا مگر سلطان تغلق کے زمانہ میں سنہ [illegible]ھ میں مسجد اور مدرسہ کی تعمیر باقاعدہ عمل میں آئی۔ فتوحات فیروز شاہی میں ان مدرسوں کا ذکر ملتا ہے۔ ابن بطوطہ نے دہلی کے علما دہلی کے ضمن میں یہاں کے علماء و فضلا سے متعلق کافی اطلاعات بہم پہنچائی ہیں۔ بلکہ یہاں ہمیشہ علوم کا چرچا رہا۔

لودھیوں میں سلطان سکندر لودھی کو علمی معلومات اور علوم کی سرپرستی میں خاصی دلچسپی تھی۔ کیونکہ وہ خود فاضل تھا۔ اور علماء کی قدر کرتا تھا۔ اس کے دربار کے علما میں خاص کر مولانا شیخ جمالی کنبوہ صاحب سیر العارفین" قابل ذکر ہیں جو ہمہ صفت موصوف تھے۔ آپ جب حج سے واپس آئے تو سلطان نے ایک نامہ منظوم بدستخط خاص لکھ کر شیخ جمالی کی طلب میں ارسال کیا۔ وہ یہ ہے ؎

آں مخزن گنج لایزالی   وے سالک راہ دیں جمالی   –   درگرد جہاں بسے کردہ سیر   درمنزل خود رسیدہ بالخیر
بودے تو مسافر زمانہ   الحمد کہ آمدی بہ خانہ   –   در مکہ و مدینہ گشتی   گوہر بودی خزینہ گشتی
اے شیخ بما برس بزودی   بسیار مسافرت نمودی   –   بکشائے بسوئے ورگہم گام   تا دریابی ز گلرخی کام
چشم بہ جمال تو طپاں است   دل مرغ مثال در فغاں است   –   من اسکندر تو خضر مائی   آں بہ کہ بہ سوئے ما بیائی
در شیخ زودتاں نہ شد سیر   تشریف نمودنش کشد دیر   بایدکہ کتاب مہر و ماہم   ارسال دہد چنانکہ خواہم
از مہر کشد دو دیدہ را نور   آں مہ نشود ز دیدہ ام دور

شیخ جمالی نے اس کے جواب میں رقعہ منظومہ تحریر کرکے مثنوی مہر و ماہ بادشاہ کے پاس بھیج دی۔ نواح قطب میں درگاہ جمالی کی عمارت بہت مشہور ہے جسے آپ نے خود اپنی زندگی میں تعمیر کروایا تھا اور یہیں آپ کا انتقال سنہ ۹۴۲ھ میں ہوا۔ جمالی نے آنحضرت صلعم کی نعت میں لکھا ہے ؎

موسیٰ زہوش رفت بیک پرتو صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی

۱؎ نفحص سکندر لودھی

بہمنی سلطنت

آٹھویں صدی ہجری ہندوستان میں بہت ہیجان کا زمانہ تھا۔ بلکہ قریب قریب تمام صوبے مرکز سے خود مختار ہو گئے تھے۔ سلطان محمد تغلق اپنے عملی اور اصلاحی جوش میں دہلی سے دولت آباد دکن پر دار الحکومت کو تبدیل کرتا اور پھر ناکام ہو کر واپس آتا بھی نظر آتا ہے۔ بلکہ دکن ہی مرکز سے سب سے پہلے خود مختار ۷۴۳ھ میں ہوتا ہے۔ اور ہندوستان میں یہ ایک ایسی سلطنت کی بنیاد پڑتی ہے جو نام سے تو بہمنی سلطنت کہلاتی ہے۔ مگر در اصل اسے ہندوستان میں ایک ایرانی سلطنت کہا جائے تو بہتر ہے کیونکہ اس کا بانی سلطان علاء الدین حسن بہمنی قدیم ایرانی الاصل خاندان سے تھا۔ اور اس سلطنت نے بلکہ براہ راست تعلقات ایران سے پیدا کر لئے تھے جس کا نتیجہ ظاہر تھا کہ عراق و عجم سے علماء و فضلا کافی تعداد میں سمندر و خشکی کے راستہ سے دکن میں آئے۔ گلبرگہ، دولت آباد، اور بیدر یکے بعد دیگرے ان کے پایہ سلطنت رہے۔ مگر بیدر کو زیادہ اہمیت حاصل رہی۔ آج بھی اس سلطنت کے بے شمار تعمیری آثار نہایت اچھی حالت میں ان مقامات میں ملتے ہیں۔ مثلاً گلبرگہ کی جامع مسجد اپنی تعمیری خوبیوں کی وجہ سے عالم بھر میں مشہور ہے۔ لوگ عام طور پر اس کا مقابلہ قرطبہ کی مشہور مسجد سے کرتے ہیں۔ اس کا معمار رفیع بن شمس بن منصور قزوینی تھا جس نے اسے محمد شاہ بہمنی اوّل کے زمانہ میں ۷۶۹ھ میں تعمیر کیا۔ جو میں خیال کرتا ہوں کہ اپنے زمانہ میں بہت بڑی دانشگاہ بھی تھی۔ دار الحکومت بیدر میں سلطان احمد شاہ ولی بہمنی (۸۲۹ھ) کا روضہ شکر اللہ نقاش قزوینی کا تعمیر کردہ ہے۔ جسے اس نے بادشاہ کی حیات میں ہی تعمیر کیا تھا۔ اسی طرح قلعہ بیدر میں محل کے ماتھے پر ایرانی قومی نشان شرزہ جو ایک پاؤں اٹھائے ہوئے پشت پر آفتاب طلوع ہوتا چوکور کاشی کاری کی اینٹوں میں ایرانی طرز میں منقش ہے۔ ان امور سے واضح ہے کہ یہ ایرانی الاصل تعمیرات ہیں اور یہی ایرانی ماحول تھا۔

مدرسہ خواجہ محمود گاوان۔ بیدر

اسلامی سلطنتوں کے وزراء میں نظام الملک طوسی کا بہت بلند درجہ وسط ایشیا میں ہے۔

جیسا کہ ہم نے یہاں بیان بھی کیا ہے مگر اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر ہم یہاں دکن میں یہی کمالات خواجہ عماد الدین محمود وزیر سلطنت بہمنی میں دیکھتے ہیں۔ جو گیلان کا باشندہ تھا اور آپ کے خاندان کے افراد شاہان گیلان کے وزراء بھی رہے تھے۔ خواجہ دکن میں ایک تاجر کی حیثیت سے براستہ بندر دابھول پر اتر کر نہایت پُر آشوب زمانہ میں داخل ہوا۔ سلطان علاء الدین علم دوست اور علماء و فضلاء و شعرا کا قدردان تھا۔ اس لئے اس کو خواجہ محمود گاواں جیسے جہاندیدہ عالم و فاضل و تجربہ کار شخص کی صحبت میں بہت لطف آیا۔ اور چند ہی روز میں اسے دربار میں بلند مرتبہ حاصل ہو گیا۔ اور وہ وہ جوہر دکھائے کہ آخر اسے خواجہ جہاں کا لقب ملا۔ اور وہ وزیر کل ہو گیا۔ آپ نے بیدر میں ایک عظیم الشان مدرسہ کی بنیاد رکھی جو آخر ۸۷۶ھ میں تیار ہو گیا جس کا قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

این مدرسہ رفیع محمود بنا — چو کعبہ شدہ است قبلہ اہل صفا
آثار قبول بین کہ شد تاریخش — از آیت "ربنا تقبل منا"

یہاں یہ ایک اشارہ کرنا لازمی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی قدیم زمانہ کی یونیورسٹیوں میں دو زیادہ جو مشہور تھیں وہ دکن کی اجنٹا اور ایلورہ تھیں۔ اوّل الذکر تو خالصاً بدھ مت کے بھکشوں کی دانشگاہ تھی اور مؤخر الذکر کی ابتدا تو بدھ مت سے ہوئی مگر زمانہ مابعد میں دوسرے جینی و ہندو مذاہب کے مدارس بھی یہاں قائم رہے۔ جو بہت قبل عہد اسلامی مٹ چکی تھیں۔ جن کے آثار آج بھی باقی ہیں۔ مگر جب سے دکن میں اسلام آیا اس قدیم علمی ماحول کا اعادہ بصورت مدرسہ اسلامی خواجہ محمود گاواں ہوا۔ یہ یونیورسٹی پدران سے بھی بڑھ کر زیادہ بین الملی اوصاف لئے ہوئے تھی۔

اگرچہ ہم متذکرہ بالا سطور میں کافی چیدہ چیدہ مدارس کا ذکر کر چکے ہیں مگر ہنوز ہم کسی ایسے مدرسہ کا صحیح نقشہ پیش نہیں کر سکے جس سے ہم آج جواب مطالعہ کر سکیں بلکہ راقم کے نزدیک بین الملی حیثیت سے صحیح معنوں میں بیدر کا یہ مدرسہ ہے جو ایک عجیب و غریب عمارت ہے جو

خواجہ کی مفصل حیات کے لئے سیرۃ المحمود از عزیز مرزا اور تاریخ فرشتہ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

دُور سے دیکھنے سے کسی سمرقند کی عمارات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور قریب قریب اصفہان کی مسجد کے نقشہ پر ضرور ہے۔ مدرسہ کی عمارت کا طول ۲۰۰ فٹ اور عرض ۱۷۰ فٹ ہے۔ اس کی عظمت و شان کا تھوڑا سا اندازہ اس کی تین منزلوں والی بلندی سے ہو سکتا ہے۔ جو ۵۸ فٹ سے زیادہ بلند ہے۔ اس عمارت کے ماتھے پر دو عظیم الشان مینار تھے۔ جن میں سے ایک آج باقی ہے۔ اس کی بلندی ۱۹۰ فٹ کے قریب ہے اور یہ مینار دولت آباد کے چاند مینار کے مشابہ ہے۔ پرانی روایات کے ماتحت اس کے درمیان صحن میں مغرب کی طرف ایک مسجد بھی ہے۔ جس کا محراب بالکل واضح ہے۔ تینوں منزلوں میں جماعتوں کے کمرے ہیں۔ اور واساتذہ کے رہنے کے لئے اور کتب خانہ کے لئے کمرے الگ نظر آتے ہیں۔ اور قیام طلباء کا بھی انتظام ہے۔ اس کے ماتھے پر کاشی کاری کی اینٹیں سبز، نیلے اور پیلے رنگوں میں لگی ہوئی ہیں۔ اور خوبصورتی اور مضبوطی حاصل کرنے کے لئے ان سے بعض نقوش ترچھے بھی نہایت عمدہ مہندسی اشکال میں لگائے گئے ہیں جیسا کہ سمرقند اور قزوین کی عمارتوں میں بھی لگی ہوئی ہیں مدرسہ کے ماتھے کی دیوار پر سر بسر قرآن کریم کی آیات سورۂ زمر سے کاتب علی الصوفی نے نہایت عمدہ خط نسخ میں لکھی ہوئی ہیں۔ اور عمارت میں جا بجا شلغمی شکل کی گنبدیاں بھی ہیں۔ یہ مدرسہ ۱۰۲۳ھ تک مکمل حالت میں تھا۔ جیسا کہ فرشتہ نے اسے دیکھا ہے اور ۱۱۰۷ھ میں اس مدرسہ کا مشرقی جنوبی کونہ بجلی گرنے سے تباہ ہو گیا۔

خواجہ کی شخصیت ایک بین الملی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی دو تصانیف مناظر الانشاء جو فن انشاء پر ہے اور ریاض الانشاء جس میں ان خطوط کا مجموعہ ہے جس میں خواجہ نے اپنے معاصرین علماء کو خطاب کیا ہے۔ جن میں قابل ذکر شیخ صدرالدین رواسی، مولنا جامی ہرات خواجہ عبداللہ پسر خورد سلطان ابوسعید گوگان، سلطان محمد میرانک، سلطان علاءالدین شاہ گیلان، عبدالرزاق سمرقندی، محمود شاہ سلطان گجرات، عبدالملک اس میں محمود خلجی مالوہ کے حملہ کی مدافعت کا ذکر ہے۔ شیخ داؤد ایلچی سلطان مالوہ، عبدالملک بھتیجا خود۔ اپنے بڑے بھائی کے نام جو اس وقت گیلان میں وزیر تھے۔ اس میں تاج الدین بن نجم الدین کا ذکر ہے سلطان جونپور، مولنا شمس الدین لاری، الغ خاں ملک التجار، مولنا ابوسعید، سید مہدی طبریزی

اپنے بیٹے عبداللہ کے نام، سید شریف جرجانی کے بیٹے سید ابراہیم کے نام جنہوں نے بیدر آنے کی اطلاع دی تھی۔ اور خواجہ محمود گاواں نے اس پر مولانا جامی کو لکھا اور مولانا سے ملاقات کی تمنا ظاہر کی ہے۔ مولانا کمال الدین قزوینی جس میں خلیل اللہ کا ذکر ہے۔ خواجہ جمال الدین حسین کو لکھا جب کہ وہ مکہ اور مدینہ کی زیارت کے بعد دابول کی بندر پر اترا۔ سلطان حسین مرزا بائسنغر کے نام۔ امیر جہان شاہ لاری، علامہ علاء الدین عبداللہ کے نام، قاضی شرف الدین صدر جہاں کے نام، برہان الدین ابراہیم مکہ معظمہ میں، اپنے بیٹے علی کے نام، شیخ بایزید خلخانی مخدومہ جہاں شہزادی گیلان۔

اس عظیم الشان مدرسہ کا وجود ہندوستان میں ہمیں ایک دانشگاہ اسلامی کا صحیح نقشہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدرسہ ہمیشہ آباد رہا کیونکہ راقم نے ایک مرتبہ بیجاپور میں درگاہ خواجہ امین الدین کی قدیم لائبریری کا ملاحظہ کرتے ہوئے ایک مخطوطہ "زبدۃ الاخبار من احادیث احمد مختار" دیکھا تھا۔ جسے عبداللہ بن الفقی عبدالرحمن المکی نے ۲۷ ر ذوالقعدہ ۸۸۵ھ میں اسی مدرسہ میں بیٹھ کر لکھا تھا۔ خواجہ کا انجام اہل دکن کے ہاتھوں شہادت سے ۸۸۶ھ میں ہوا۔ جسے نہایت خوبی سے یوں ادا کیا گیا ہے ؎

"بیگنہ محمود گاواں شد شہید"

یہ عام متذکرہ بالا مختصر کیفیت دانشگاہیں جو بعہد اسلامی قرون وسطی میں یا موجود تھیں ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس قدر تعداد میں اور کس کس پایہ کے لوگ ان سے بہرہ ور ہو کر نکلے۔

خواجہ محمود گاواں کے مدرسہ بیدر کی تاریخ بنا کو ملا سامعی نے یوں موزوں کیا ہے ؎

ایں مدرسہ رفیع محمود بنا	چو کعبہ شد است قبلہ اہل صفا
آثار قبول بیں کہ تاریخش	از آیت ربنا تقبل منا

محمد قاسم فرشتہ اپنی تاریخ بنام گلشن ابراہیمی میں بیان کرتا ہے کہ یہ مدرسہ مسجد چار طاق اور بازار اس کتاب کی تحریر کے وقت ۱۰۲۳ھ تک موجود تھے۔ یعنی یہ جامع العلوم (یونیورسٹی) دکن میں اسلامی علوم کی نہایت عمدگی سے خدمت کر رہی تھی۔

سلاطین صفویہ

بہزاد شہر ہرات میں پیدا ہوا اور وہیں تربیت ہوئی اور وہیں وہ سلطان حسین مرزا کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ مگر جب ۹۲۸ھ میں صفویوں نے تیموریوں پر یورش کی اور سلطنت ایران کا مرکز ہرات کی بجائے تبریز قرار پایا اور اسی دوڑ دھوپ میں بیشمار انسانوں کا خون بھی ضائع گیا۔ مگر شاہ اسمٰعیل متمنی تھا کہ اہل علم و ہنر کو کسی طرح کوئی ایذا نہ پہنچے۔ اس وقت خاص کر اس کے سامنے استاد بہزاد نقاش اور شاہ محمود خطاط نیشاپوری تھے۔ چنانچہ اس نے حالت جنگ میں ان دونوں کو ایک غار میں پناہ دیدی تھی۔ جب جنگ کا خاتمہ صفویوں کے حق میں ہوا تو وہ فوراً ان کو اپنے ہمراہ تبریز لے آیا۔ اور وہ بہت نازاں تھا کہ اللہ کے کرم نے اس کے ہاتھوں اُن دو ائمہ فن کی جان بچ گئی۔ اس نے بہزاد کو فوراً اپنے کتب خانہ کا مہتمم مقرر کیا۔ اور شاہ محمود نے ایک خمسہ لکھنا شروع کیا جسے بہزاد نے اپنے دیگر رفقائے کار کے تعاون سے مکمل کیا۔ ایرانی مصوّری کا یہ شاہکار آج برٹش میوزیم میں محفوظ ہے[1] اور یہ رنگوں میں طبع بھی ہو چکا ہے۔ اس طرح محمد شیبانی خاں نے جب حملہ کیا تو بہت سے فن کاروں نے وہاں سے نکل کر بخارا میں جا کر سلطان عبدالعزیز والئے بخارا کے ہاں پناہ لی۔ جن میں قابل ذکر میر علی ہروی کاتب بھی ہے۔ غرضیکہ اگر اس وقت ان اصحاب ہنر کی پروا نہ کی جاتی تو آج کون ایرانی مصوری کے اس قدر کارنامے دیکھتا۔ غرضیکہ یہ محض ہنر شناسی اور ہنر افزائی و ہنر پروری کی بدولت ہے۔ بہزاد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایرانی مصوری کو چینی اثر سے پاک کر دیا۔

شاہانِ مغل - بابر

ہمیں خوب علم ہے کہ سلاطین ہند میں فیروز شاہ تغلق سب سے اوّل نظر آتا ہے جس نے اپنے عہد کے واقعات و حالات کو خود بعنوان "فتوحات فیروز شاہی" لکھا۔ جو دراصل اس کے

---

[1] فہرست مخطوطات برٹش میوزیم

عہد کی اصلاحات کا خلاصہ ہے۔ جو اس نے ملک کی فلاح وبہبود کی خاطر رائج کیں مگر وہ بادشاہ جس نے اپنے ذاتی واقعات کو من وعن نہایت آزادی اور بے تکلفی سے قلمبند کیا۔ وہ ظہیر الدین بابر بادشاہ ہے۔ یہ حالات آج تزک یا واقعاتِ بابری کے نام سے ملتے ہیں۔ یہ محض واقعات ہی نہیں ہیں بلکہ ایک بادشاہ کی خود نوشت سوانح حیات اور ادب کا بھی بہترین مرقع ہیں اس کے مطالعہ سے آج بھی بابر کی ہو بہو تصویر اپنے مکمل ماحول کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔ بابر نے ہندوستان پر فتح حاصل کرنے کے بعد یہاں تعمیرات کی طرف توجہ کی۔ جب کہ وہ یہاں کی غیر اسلامی تعمیرات کی تنگ وتاریکی اور کم بلند چھتوں اور چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں پر بڑی طرح تنقید کرتا ہے سب سے بڑھ کر یہاں کے لوگوں کے قدرت کے نظاروں سے حظ نہ اٹھانے کی شکایت کرتا ہے۔ جب کہ ان کا کسی دریا کے کنارے سے پشت کر کے خیمہ زن ہونا بجائے اس کے کہ وہ آب کی قدرتی روانی سے حظ اُٹھائیں۔ اس سے محروم دیکھ کر ان پر تاسف کا اظہار کرتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہمراہ ہر قسم کے ہم خیال اور ہر قابلیت کے لوگ موجود تھے۔ جن کا وہ سرپرست تھا۔ اگر وہ ان کی صحیح سرپرستی نہ کرتا اور ان کی تالیف قلوب کا خیال نہ کرتا تو بابر یہاں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ہمراہ کوئی بھی نہ آتا۔ سب سے بڑھ کر وہ حفظ مراتب کا خیال رکھتا تھا۔

بابر کی شخصیت بھی عجیب وغریب ہے۔ اور عرف عام میں وہ ہندوستان کی سلطنت مغلیہ کا بانی شمار ہوتا ہے۔ مگر ہندوستان میں آنے سے پیشتر ۹۱۷ھ میں کچھ مدت کے لئے وہ سلطنت صفویہ کا باجگذار ہو گیا تھا۔ اور اس کا دار السلطنت سمرقند تھا جہاں اس نے ائمہ اثنیٰ عشر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور شاہ اسمٰعیل صفوی کے نام پر سکے مضروب کرائے تھے اور اپنے مقبوضہ علاقہ میں شیعی طور طریق کو رواج دیا کیونکہ بابر نے صفویوں کی مدد سے پہلے بخارا پھر سمرقند پر قبضہ کیا۔ بقول غیاث الدین خوندمیر نے حبیب السیر

میں جو ۹۳۵ھ میں بابر کی زندگی میں تصنیف کی لکھا ہے کہ بابر نے شاہ اسمٰعیل صفوی سے امداد لیتے وقت اقرار کیا تھا کہ اگر آپ کی مدد سے ماوراءالنہر فتح ہو جائے تو اس ولایت میں آپ کے نام سے خطبہ اور سکہ جاری کیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا وقوع میں آیا۔ مگر جب بابر کو وہاں کے حالات سازگار نہ ہوئے تو اسے سمرقند چھوڑ کر ہندوستان کا رُخ کرنا پڑا۔ اور جب اس نے ۹۳۲ھ کو ابراہیم لودھی پر فتح پائی تو اس نے جو سکے یہاں مضروب کرائے ان پر شیعی کلمات کی بجائے اہلِ سنت والجماعت کے معتقدات کو کندہ کرایا اور یہ ہر دو قسم کے سکے آج برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک سکہ پر ۹۳۶ھ ہے جو لاہور میں مضروب ہوا۔ اگرچہ عام طور پر بابر کی زندگی کے واقعات میں اس واقعہ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی مگر ہم نے بھی محض اس کو سپاہیانہ روش زندگی کا ایک اعلیٰ کارنامہ تصور کرتے ہوئے درج کیا ہے کہ اس نے ہمیشہ محض ایک فن کار کی خواہ کسی رنگ میں تھا زندگی بسر کی اور ہمیشہ خوش اور کامیاب رہا۔ اور اس کے اسی اصول پر یہاں مغلوں نے تین صدیوں سے اوپر جس شان و شوکت سے سلطنت کی تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔

ہمایوں

صفوی دور کی علمی فیاضیاں اور علمی سرپرستیاں بہت ہیں۔ یعنی ان سلاطین نے سلطان حسین مرزا کی روایات علم و ہنر کو پوری طرح برقرار رکھا۔ اس کے لئے ہمیں حبیب السیر اور عالم آرائے عباسی کا مطالعہ کرنا چاہئے کہ کس کس شان کے ہنرور وہاں اُن کے دربار میں جمع تھے۔ یہی ایک وجہ تھی کہ جب ہمایوں نے اپنے بھائیوں کے پریشان کن رویہ اور سوریوں کی آئے دن کی یلغاروں سے تنگ آکر ایران کے شاہ طہماسپ صفوی کے پاس جانے کا مصمم ارادہ کر لیا تو شاہ نے اپنے مہمان کی خاطر مدارات اپنی سلطنت کے حدود سے ہی شروع کر دی تھی۔ اور ایران میں ہمایوں کو کئی سال (از ۹۴۵ھ تا ۹۶۲ھ) مہمان کی حیثیت

سے گذارنے کا موقع ملا جو بذاتِ خود ایک طویل تاریخی داستان ہے۔ ہمایوں کو جس قدر کتب بینی و مطالعہ اور کتابوں کو اپنی لائبریری میں سجا کر رکھنے کا شوق تھا وہ شاید ہی کسی اور بادشاہ کو ہوگا اور اس کا مہتمم کتب خانہ محمد مہنجو والد منشی اسکندر مصنف مراۃ اسکندری تھا وہ سوریوں کی جدوجہد میں جب احمد آباد کے حدود میں تھا تو اس کے خیمہ میں سے رات کے وقت چوری ہوگئی۔ منجملہ دیگر سامان کے ضائع ہونے والی چیزوں میں ایک مصوّر نسخہ تیمور نامہ ملا ہاتفی بھی تھا۔ جسے بہزاد نے مصوّر کیا تھا اور سلطان علی مشہدی نے لکھا تھا۔ اس کا ہمایوں کو بہت قلق تھا۔ جب وہ ایران پہنچا تو اس کو ایسے ہزاروں مصوّر نسخے شاہ طہماسپ کے ہاں ملاحظہ کرنے کا موقع ملا۔ ابھی وہ ایران میں ہی تھا اور اس کے واپس آکر کامیابی کے ساتھ تاج و تخت کے حاصل ہونے کی کوئی خاص توقع ہی نہیں تھی۔ تو اس نے اپنے ارد گرد علماء، فضلاء، خطاطوں اور نقّاشوں کا ایک مجمع پیدا کر لیا تھا۔ ان میں سے اس نے سید میر علی تبریزی مصوّر اور خواجہ عبدالصمد خطاط کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ حالانکہ ابھی اس کے حالات پوری طرح خوشگوار نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ وہاں سے چلا تو ان ماہرین فن نے کابل آکر ہمایوں کے دربار میں شرکت کی۔ اور یہیں ہر دو نے اپنے جوہر دکھائے اس نے "ہمایوں شاہی" خطاب تو میر سید علی تبریزی کو عنایت کیا۔ اور خواجہ عبدالصمد کو شیریں قلم کا لقب عطا کیا تھا۔ یہ ہر دو مصوّر استاد کمال الدّین بہزاد کے براہ راست سلسلہ مصوّری میں تلمیذ تھے۔ اگرچہ ابھی تک ہمایوں کو تاج و تخت کے حصول کی کوئی توقع بھی نہیں تھی۔ مگر یہ جوہر شناس بادشاہ ان ہر دو مصوّروں کو الگ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ادھر جب اسے کامیابی ہوئی تو حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پیشتر ہی "داستان امیر حمزہؓ" کا مصوّر نسخہ بڑے سائز کا تیار کرنے کے لئے ان ہر دو کے نام فرمان جاری کر چکا تھا۔ مگر ہمایوں دہلی کے قلعہ کہنہ میں شیر منڈل کی بلند عمارت سے چاند دیکھتے گرا اور داعی اجل کو وہیں لبیک کہا۔

اکبری دربار کے مصوّروں کے متعلق ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس امر کا اقرار

کیا ہے کہ :

"چونکہ نادرہ کاری بہزاد بحسن سحر پردازی اہل فرنگ را کہ آفاق درگرفتہ بود گزیں انبار پیدا شد"

اس کے علاوہ ابوالفضل نے اسی عبارت سے ذرا آگے چل کر میر سیّد علی تبریزی کے متعلق یوں لکھا ہے :

بن میر منصور "پیش پدر خود لختے آموختہ بود"

یعنی دربار اکبری میں بہزاد کی طرز کا رواج ہو چکا تھا۔ اور میر سیّد علی نے کسی قدر فن مصوّری کو اپنے باپ سے بھی سیکھا تھا۔ اور ادھر یہ بھی واضح ہے خواجہ عبدالصّمد شیرازی زیادہ تر کاتب کی حیثیت سے "شیریں قلم" کے لقب سے مشہور ہُوا۔ اس کے علاوہ عام طور پر اکبری عہد کے مصوّروں کے کام کے متعلق مؤرخین عہد اکبری اور دیگر محققین نے بالاتفاق داستان امیر حمزہؓ کے تحت جو عہد اکبری کا سب سے بڑا مصوّری کا کارنامہ ہے یوں لکھا ہے :

"داستان امیر حمزہؓ ... بعبارت مرغوب بحسن انشا، خواجہ عطاء اللہ منشی قزوینی مرقوم گشتہ۔ پنجاہ کس از مصوّران بہزاد قلم اول باہتمام نادر الملک ہمایوں شاہی میر سیّد علی تبریزی و آخر بسرکار خواجہ عبدالصمد شیرازی صورت گری نمودہ الحق کتابے شدہ ......"

اکبری عہد میں دراصل تمام ہندوستان کا زرعی بندوبست و دیگر شعبہ جات دستوریہ کا جائزہ لیا گیا۔ جس بنا پر آئین اکبری تیار ہوئی جو حقیقت میں ایک دستوری رپورٹ عہد اکبری کی ہے۔

اکبر

ہمایوں کے لڑکے جلال الدین اکبر کی عمر ۹۶۳ھ میں ابھی تیرہ سال تھی۔ وہ اپنے باپ کا جانشین ہونے کی حیثیت سے کلانور میں تخت نشین ہوا۔ جس نے اپنی ہنر شناسی اور ہنر پروری سے اپنے گرد تمام ملت و مذاہب کے ہنرور و ہنرمند و صناع جمع کر لئے۔ متذکرہ بالا ہمایوں کے عہد کے مصوّروں نے اکبر کے عہد میں اپنے اثر و قابلیت سے یہاں غیر مسلم مصوّروں کو اپنے نہج پر چلا کر وہ وہ شاہکار تیار کیے کہ انسان دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ یہ آج مغل قلم یا ہندو مسلم قلم کے نام سے مشہور ہیں کیونکہ وہ یہاں کے ماحول میں تیار ہوئے تھے۔ اگر یہ تمام تصاویر نہ ہوتیں تو ہم اس عہد کے صحیح ماحول کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے تھے۔ اور یہ سب اکبر و ہمایوں کی ذاتی توجہ، ہنر شناسی و ہنر پروری مصوری کا نتیجہ تھا ابوالفضل اور ان کے بڑے بھائی ابوالفیض فیضی کی حوصلہ افزائی نہ ہوتی تو ہمیں اس عہد سے متعلق صحیح معلومات بھی نہ ہوتیں۔ اور آئین اکبری و اکبر نامہ ایسی کتب تاریخ بھی میسّر نہ آتیں۔ جس نے عہد اکبر کے ہر شعبۂ زندگی کو پوری طرح اجاگر کر دیا ہے۔ اور اسی عہد میں دراصل تمام ہندوستان کا زرعی بندوبست و دیگر شعبہ جات دستوریہ کا جائزہ لیا گیا جس بنا پر آئین اکبری تیار ہوئی جو حقیقت میں ایک دستوری رپورٹ عہد اکبری ہے۔ ان ہر دو بھائیوں کے علمی کارناموں کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اکبر خود ان میں متکلم و جلوہ گر نظر آتا ہے یہ محض اکبر کی پالیسی تھی کہ تمام ہندوستان کو جو عہد تغلق سے مرکز سے برگشتہ ہو چکا تھا پھر ایک مرکز کے تحت لے آیا اکبر کے عہد کے فنی کارناموں میں فتح پور سیکری کی تعمیر بھی ہے۔ یہاں کی عمارتیں عام طور پر سُرخ پتھر کی تعمیر کی ہوئی ہیں۔ مگر یہ طرز تعمیر خاص طور پر عہد اکبری یا طرز اکبری کے نام سے زیادہ مشہور ہے اس کا کچھ ماحول یا نمونہ لاہور کے قلعہ میں اس عہد کی عمارات کے دوبرہ آمدوں سے جو میوزیم کے مغرب و مشرق کی جانب موجود ہیں ملتا ہے۔ اکبر کے عہد میں ہندوؤں سے جو حسن سلوک کیا گیا وہ

کسی عہد میں نہیں ہوا۔ ان کی وجہ سے اکبر نے ایک بہت بڑا کارنامہ یہ کیا کہ سنسکرت کی معیاری کتب کے فارسی تراجم کرائے جس سے یہ کتب بالکل تباہ ہونے سے بچ گئیں۔ ساتھ ہی ان کے مصوّر نسخے تیار کئے گئے۔ یہ سب علوم و فنون کی سرپرستی کا ثمرہ تھا۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی نے اکبر کے ان کارناموں پر مفصّل لکھا ہے۔ کہ شاعر، مصوّر، کاتب، عالم کو کیا کیا انعام و اکرام ملے جس کی مثال ناممکن ہے۔ غرضیکہ ہند و پاکستان میں جو اکبر کے عہد کے علوم و فنون میں فروغ ہوا وہ کبھی نہیں ہوا تھا۔

اکبر کے عہد کا سب سے بڑا کارنامہ اس کا ایجاد کردہ مذہب دینِ الٰہی ہے جو عام طور پر ہر علمی محفل میں گفتگو و بحث کا موضوع بن جاتا ہے۔ کوئی اسے کافر کہتا ہے کوئی ملحد، جو اسلامی مذہبی نقطۂ نگاہ کی حد تک ٹھیک ہے۔ مگر جب ہم نہایت وسعت نظری سے مذہبی نقطۂ نگاہ سے ذرا ہٹ کر خواہ سیاسی حیثیت سے ہی اس کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اکبر کی محض اس پالیسی کی وجہ سے ہر مذہب و ملت کے فاضل و محقق کو اس کے دربار تک رسائی ہو گئی۔ اور ہر ایک کو نہایت آزادی سے اپنا نقطۂ نگاہ پیش کرنے کا موقع ملا۔ یعنی ایک طرح کا مذہبی قیود سے انحراف آزادی کی طرف بادشاہ کی طرف سے تھا۔ لیکن یہاں تک کہ اس نے مریدی کا ڈھونگ رچایا تھا۔ جس میں چار مرتبے تھے۔ اور ایک عبادت خانہ بھی اس نے فتح پور سیکری میں ایک خاص ڈیزائن کا تیار کرایا تھا۔ جس میں ہر مذہب و ملت کے اکابر و محققین سے آزادانہ مذاکرہ کی مجالس لگا کرتی تھیں۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں اکبر کے عہد کی چند تصاویر بھی ملتی ہیں جن میں اکبر مع شہزادہ سلیم تو مرکز میں نشست رکھتے ہیں اور ان کے گرد کافی بزرگان مذاہب دیگر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ غرضیکہ اکبر کا یہ عمل اس امر کا محرک ضرور ہے کہ ہر مذہب و ملت کے ہنرور، ہنر شناس کی ہنر افزائی ہوتی رہی۔ اور اس ضمن میں کافی آزادانہ طور پر تحریریں بھی وجود میں آئیں۔

اکبر کے درباری امراء میں بعض ایسے ایسے باکمال حضرات تھے جو بذاتِ خود بصورتِ شخصِ واحد

ایک بہت بڑا محکمہ تھے۔ ان میں قابل ذکر بیرم خاں ترکمان اور عبدالرحیم خانخاناں ہیں۔ عبدالرحیم خانخاناں امرائے اکبری کا گل سرسبد تھا۔ اس زمانہ میں وہی ایک شخص تھا جس کے تاج فخر پر صاحب السیف والقلم کا طرّہ زیب دیتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا جنگی کارنامہ فتح گجرات تھا۔ جو ۹۸۱ھ میں ہوئی۔ جس کے صلہ میں اکبر کے دربار سے اسے خانخاناں کا خطاب ملا تھا۔ اس کے اپنے ہاں باقاعدہ درباداری کا طریق ویسا ہی تھا۔ یعنی فضلاء، شعراء، خطاط، نقاش، وجدول نگار وغیرہ سب موجود تھے جو حسب ارشاد مخطوطے تیار کرتے رہتے تھے۔ اور آج بے شمار ہمارے کتب خانوں میں باعث زینت و نیضان ہیں۔ اور شعراء اپنا کلام پیش کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اہل ایران یہاں زیادہ براہ راست آتے تھے کیونکہ ترکمان بیرم خاں کا خاندان ایرانی النّسل ہونے کی حیثیت سے زیادہ شہرت رکھتا تھا۔ اس لئے بھی وہ لوگ کچھ نسبتی اور صلبی استحقاق سمجھتے تھے۔ ان کی شاہی دربار سے بھی زیادہ قدردانی ہوتی تھی۔ اور ان کی حوصلہ افزائی بصورت گراں بہا انعامات ہوتی تھی۔ مولانا شبلی نے عرفی کے ذکر کے تحت لکھا ہے کہ چونکہ خانخاناں کے دربار میں بڑے بڑے نامور شعراء مثلاً نظیری نیشاپوری، شکیبی اصفہانی السینی ظہوری وغیرہ سے مقابلہ رہتا تھا۔ عرفی کا کلام روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ تقرب اور اختصاص میں بھی وہ حریفوں کی صف کو چیرتا ہوا آگے نکل گیا۔ یہ بات اسی کو نصیب ہوئی کہ دربار میں جاتا تھا تو عام طریق آداب و کورنش بجالاتا تھا۔ اور جس طرح چاہتا تھا بیٹھ جاتا تھا۔

خانخاناں کے حالات میں مآثر رحیمی ایک ضخیم کتاب مؤلفہ عبدالباقی نہاوندی جو تین ضخیم جلدوں میں طبع ہو چکی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرفی کو ایک مرتبہ ۰ے ہزار روپے انعام دئے۔ عرفی نے کسی اور کی مدح سرائی گوارا نہیں کی۔ مگر اس نے خان خاناں کے فرمانے پر اکبر کی مدح میں متعدد قصائد لکھے۔ جو دراصل بالواسطہ طور سے خانخاناں ہی کے قصائد ہیں۔ عرفی کو لاہور میں امانتاً دفن کیا گیا۔ مگر بعد میں اس کی وصیت کے مطابق خانخاناں ہی نے اس کی ہڈیاں لاہور سے نجف اشرف ارسال کرائیں۔ یہاں تک ختم نہیں گیا بلکہ اس کے بعد اس کے

مسودہ دیوان کو ترتیب دینے والے محمد قاسم مشہور بہ سراج کو انعام واکرام سے مالامال کر دیا۔ اسی طرح ہمیں خانخاناں کے ضمن میں ایک اور شاعر نظیری نیشاپوری کا ذکر کرنا ہے۔ شعر و سخن فہمی کے معاملہ میں خانخاناں اہل ایران میں کافی مشہور ہو چکا تھا۔ اور اس کی فیاضیوں اور ہنروروں کی سرپرستیوں کا شہرہ دُور دُور پھیل چکا تھا۔ نظیری نے آتے ہی جو قصیدہ اس کی مدح میں لکھا اس کا عنوان بہت تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

نظیری نے خانخاناں سے ایک مرتبہ کہا کہ اگر لاکھ روپیہ کا ڈھیر لگایا جائے تو کس قدر ہو گا۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ خانخاناں نے لاکھ روپیہ منگوا کر سامنے رکھ دئے۔ نظیری نے کہا خدا کا شکر ہے آپ کی بدولت میں نے لاکھ روپیہ تو دیکھ لیا۔ خانخاناں نے روپے اسی کے گھر بھجوا دئے۔ ایسے واقعات سے اس عہد کی تمام کتابیں بھری پڑی ہیں۔ کہ کس طرح اہل قلم وہنر کے ساتھ گراں بہا اکرام واحترام و انعام سے سلوک کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت کے علوم وفنون کا ایک معیار رہا ہے۔ افسوس آج عدم سرپرستی کے باعث کوئی معیار تو کیا اصل فنون ہی مفقود ہو رہے ہیں۔ اور اہل ہنر یا اہل قلم ممکن ہے موجود ہوں لیکن گمنامی کے عالم میں ہیں۔ اسی دربار خانخاناں میں ایک کاتب عبدالرحیم تھا۔ جسے عنبریں قلم کا خطاب ملا تھا۔ جب جہانگیر نے اس کے کارنامے دیکھے تو اس کو اپنے ہاں لینے کی خواہش کی۔ تو خانخاناں نے اسے باعث افتخار سمجھ کر اس کی خدمات کو شاہی دربار سے متعلق کر دیا۔ مگر وہ اس پر مطمئن تھا کہ وہ خانخاناں کا پروردہ ہے۔

متذکرہ بالا فتح گجرات کے بعد عبدالرحیم خانخاناں احمد آباد میں مقیم ہوا۔ اور اس نے وہاں بے شمار عمارتیں اپنے نہج پر تیار کرائیں۔ بلکہ اس نے وہاں حمام کو رواج دیا جو اس نے محمد علی گرگ ابرائی کے ذریعہ کیا۔ اور مآثر رحیمی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پیشتر گجرات میں ایسے حمام کا رواج نہیں تھا جیسا کہ ہم اسلامی ممالک میں ابتدا سے دیکھتے ہیں۔ بلکہ وہ گجراتیوں کے اس نعمت سے محروم ہونے پر تاسّف کا اظہار کرتا ہے۔ اس کا باغ وہاں

آج بھی احمد آباد میں فتح باری کے نام سے موجود ہے۔ اس کے بعد اس باغ میں اس کی لڑکی رہائش رکھتی تھی۔ جب جہانگیر اپنے عہد حکومت میں احمد آباد میں آیا تو اس لڑکی نے جہانگیر کی ایک شاہانہ دعوت کی۔

جہانگیر

اکبر کے بعد اس کا لڑکا جہانگیر ۱۰۱۴ھ میں تخت نشین ہوا۔ یہ جن حالات اور ناز و نعم سے پلا وہ ہمارے سامنے ہیں۔ جن کا نتیجہ اس کے ذاتی کردار سے بالکل واضح ہے یعنی وہ جمالیات کا مجسمہ تھا۔ فن مصوری میں وہ خود معنوی اعتبار سے ایک اعلیٰ پایہ کا مصور تھا۔ شعر و شاعری میں وہ بذات خود ایک محفل تھا۔ جن کا مظہر بدرجہ اتم اس کی اپنی توزک کے الفاظ سے واضح ہے۔ جس میں اس کی ہنر شناسی اور ہنر پروری واضح ہے۔ اس نے ابوالحسن کو نادر الزمان اور منصور کو نادر العصر کے خطاب عنایت کئے۔ جنہوں نے بادشاہ کی اس فراخدلی سے متاثر ہوکر وہ شاہکار تیار کئے کہ آج دنیا کی فن کی تاریخ میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ اس نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ مستقل طور پر جب لاہور کے قلعہ کی عمارت کی تجدید کی تو اس کی شمالی دیوار پر کاشی کاری میں اپنے درباریوں کی شبیہات کو بصورت پکچر گیلری بنوایا۔ اور آج تک بعض ان میں اچھی حالت میں نظر آتی ہیں۔ نور جہاں کے اس کے عقد میں آجانے سے دربار کا رنگ خالص ایرانی ہوگیا۔ یعنی ایک چاشنی آگئی جو بصورت معنوی ظاہریات کو چھوڑکر رو پذیر ہوئی۔ یہ سب کچھ اس کی ذاتی حسن پرست، ہنر پرور طبیعت کا نتیجہ تھا۔ جو بھی صاحب فن و قلم اس کے دربار میں آیا شاداں و کامراں ہوکر لوٹا۔

جب ہم شعرا کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو جہانگیر کے عہد میں ملک الشعراء طالب آملی ایک نوجوان شاعر نظر آتا ہے جو عبداللہ خاں کے بلانے پر ہندوستان آیا اور اسے جہانگیر کے دربار میں لے جانے کے لئے کہا مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر اس نے اعتماد الدولہ کا وسیلہ تلاش کیا۔

تعارف دیانت خاں سے کرایا۔ مگر اب بھی کوئی کامیابی زیادہ نہیں ہوئی۔ اعتماد الدّولہ نے مہرداری کی خدمت سپرد کی۔ اور وہیں سے زمرۂ شعراے دربار میں شامل ہوا۔ ۱۰۲۸ھ میں اسے ملک الشعراء کا خطاب عنایت ہوا۔ مگر ۱۰۳۶ھ میں طالب آملی کا عین شباب میں انتقال ہوا۔ جہانگیر نے جو مراعات اعتماد الدّولہ کے ساتھ محض اس لئے نہیں کیں کہ وہ نورجہاں کا باپ تھا بلکہ وہ ایک قابل منتظم تھا۔ اس کا روضہ آگرہ میں جو آج اس کے نام اعتماد الدولہ پر مشہور ہے اپنی فنی خوبیوں کی وجہ سے کسی طرح تاج سے کم نہیں ہے۔ اس کے لئے نورجہاں نے خاصکر ایرانی کاریگروں اور ماہرین فن کو ہندوستان لانے کا انتظام کیا۔ اگر ان لوگوں میں اس وقت ہنرور کی ہنرپروری کا خیال نہ ہوتا تو یہ فنی کارنامے آج دیکھنے میں نہ آتے۔ یہ محض جہانگیر کے ذوق کا نتیجہ تھا۔ تاج تو اپنی جگہ ضرور عجائبات روزگار میں ہے مگر جہانگیر کے عہد کی عمارت اعتماد الدّولہ کا مقبرہ ایک خاص عمارت ہے۔ اسی طرح روضہ اکبر ہے جسے جہانگیر نے اپنے والد مرحوم کی طبیعت کے مطابق ایک خاص شان لئے تعمیر کرایا تھا۔ غرضیکہ یہ سب کچھ ان ہنرورں کی سرپرستی اور ان کو اطمینان بخشنے سے ہوا۔ جہانگیر کے دربار میں ایک فرانسیسی آسٹن ڈی بورڈو تھا۔ وہ اس ہنرمند کے کارناموں سے اس قدر محظوظ ہوا کہ آخر اسے ہنرمناہی کا خطاب عنایت کیا جس کا ذکر اس نے تزک میں بھی کیا ہے۔

شاہجہاں

تاریخ ہندوپاکستان میں ۱۰۳۷ھ کا سال بہت اہم ہے جب جہانگیر کا انتقال ہوا۔ اور اس کی جگہ اس کا لڑکا شاہجہاں تخت نشین ہوا۔ جس کی بیوی ممتاز محل کا انتقال ۱۰۴۰ھ میں برہانپور میں ہوا۔ شاہجہاں نے مرحومہ کا روضہ آگرہ میں جمنا کے کنارے شروع کیا جو ۱۰۵۰ھ میں پایہ تکمیل کو پہنچا اور تاج محل کے نام سے مشہور ہوا۔ اور آج یہ عمارت اپنی فنی خوبیوں کی وجہ سے عجائبات عالم میں شمار ہوتی ہے۔ اس عمارت کا مشاہدہ انسان کو پُرامن،

پُرسکون، پراطمینان اور مسرّت بخش فضا پیش کرتا ہے۔ جس میں وہ سرشار ہو کر اس عمارت کے کونہ کونہ میں گھومتا ہے، مگر وہ اپنے جذبات کا صحیح طور سے اظہار نہیں کر سکتا۔ کہ وہ کیا محسوس کرتا ہے۔ سوا اس کے کہ یہ کہہ دے کہ اس سے بہتر عمارت اس نے آج تک دنیا میں نہیں دیکھی پھر جب اُسے یہ معلوم ہو کہ ایک بادشاہ نے یہ عمارت اپنی مرحومہ زوجہ کی یاد میں تعمیر کی ہے تو وہ بے ساختہ اسے عشق و محبّت کا مظہر بھی کہہ دیتا ہے۔ یہ بحث کم پیدا ہوتی ہے کہ اس کا نقشہ کس نے بنایا تھا۔ اس کا معمار کون تھا یا اس پر کس قدر روپیہ صرف ہوا۔ سوال محض یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ واقعی اپنے مقصد میں ایک کامیاب مظاہرہ ہے کہ نہیں۔ اس کے بعد مشاہدہ کرنے والا دریا کا کنارہ جہاں یہ عمارت تعمیر ہوئی، سنگ جو اس کا سب سے بڑا مسالہ ہے، باغ جس سے گزر کر انسان اصل روضہ تک پہنچتا ہے۔ پھر روضہ کے مشرق و مغرب مسجد و جماعت خانہ محض موزونیت پیدا کرنے کے لئے تناظر و مرایا کو قائم رکھا گیا۔ پھر سفید مرمر کے تمام اطراف میں ماحول میں ذرا تنوّع پیدا کرنے کے لئے اس میں رنگ برنگ کی پرچین کاری کی ہے۔ بوجہ روضہ کی عمارت کے اس پر آیات قرآنی کا کندہ ہونا اور سب سے بڑھ کر اس ماحول کو مزید اہم بنانے کے لئے اس عمارت سے پہلے ایک عظیم الشان دروازہ اور اس دروازہ کے آگے ایک جلو خانہ جہاں بادشاہ کی سواری کیا سب زائرین وہیں آکر ٹھیرتے ہیں۔ تب دروازے سے ہوئے باغ کی خیابان کی سیر کرتے ہوئے اصل عمارت تک پہنچتے ہیں۔ تب کہیں انسان یہ بھی گفتگو کرتا ہے کہ بنانے والے کا دماغ نہایت موزوں اور فن لطیف سے خوب آشنا تھا۔ اور اس کا کاریگروں کا انتخاب نہایت اعلیٰ واقفیت فن کی دلیل ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ شاہجہاں نے کس قدر عمارات اپنے بادشاہی عہد میں اور بادشاہ بننے سے قبل تیار کروائی تھیں۔ جس سے وضاحت ہو جاتی ہے کہ وہ بذاتِ خود فن تعمیر کے سمجھنے میں امام کی حیثیت رکھتا تھا۔ غرضیکہ یہ عمارت راقم کے نزدیک تاریخ فنون لطیفہ مشرق میں بالخصوص اور تاریخ عالم میں بالعموم ان تمام تعمیرات

کا مجموعی حیثیت سے مظہر ہے۔ جو اس سے قبل تعمیر ہو چکی ہیں۔ آپ اس کی کسی جزو کو لے کر ذرا دیکھئے اور سوچئے یہی نتیجہ نکلے گا۔ کہ یہ تمام ہنروری، ہنر شناسی، ہنر پروری اور ہنر افزائی کا ایک مظہر بدرجۂ اتم ہے جس میں ہزارہا اہل ہنر و اہل علم کا حصّہ ہے۔ اوسکروالڈ نے کہا ہے کہ حسن کار حسین کائنات کا خلّاق ہے۔ فن کا اظہار اور فن کار کا اخفا فن کا مقصد ہے۔ اگر یہ بادشاہ تاج کو تعمیر نہ کرتا تو آج ہم اس کے دیکھنے سے محروم ہو جاتے یا بقول شخصے اگر مسلمان نعوذ باللہ ہندوؤں کی طرح اپنے مُردے جلا دیا کرتے تو پھر کوئی اس کی تعمیر کو لمحہ بھر کے لئے سوچتا بھی نہیں۔ ہر شخص کہتا ہے کہ اس بادشاہ کی قسمت میں تھا کہ وہ ایسی عمارت تعمیر کرے گا اور دُنیا اسے خراج تحسین پیش کرے گی جو صحیح معنوں میں فن کی سرپرستی واعانت کی زندہ مثال ہے۔

شاہجہاں نے جب تخت طاؤس بنایا تو مُلّا محمد جان قدسی نے اس کی تاریخ لکھی۔ شاہجہاں اس قدر خوش ہُوا کہ اسے سونے میں وزن کرا کر سونے سے مالا مال کر دیا۔ یہ معلوم ہے۔ کہ طالب آملی کی ایک ہمشیرہ ستّی النسا تھی جو مازندراں سے محض طالب سے ملنے کے لئے آئی تھی جس کی وہ ماں کے برابر عزت کرتا تھا۔ اور چودہ برس سے مُلاقات نہیں ہوئی۔ جہانگیر سے اس نے فوراً ملنے کے لئے اجازت حاصل کی۔ وہ یہاں آکر شاہجہاں کی بچیوں کی اتالیق مقرر ہوئی۔ آخر ستّی خانم اپنے حسن کارکردگی سے ترقی کرتے ہوئے تمام حرم پر حاوی تھی اور اسے صدر النساء کا خطاب ملا تھا۔ اور اُزک نامی شہر جو جاگیروں کے لئے وقف تھی وہ ممتاز کے بعد اس کے قبضہ میں رہتی تھی۔ اور خاص کر ممتاز کی بہت معتمد علیہ تھی۔ ۱۰۵۶ھ میں بمقام لاہور اس نے انتقال کیا۔ بادشاہ کو اس قدر صدمہ ہُوا کہ خود اس نے جائے مرگ پر آکر تعزیت کی۔ شاہجہاں نے خود دس ہزار روپے تجہیز و تکفین کے لئے عطا کئے۔ اور حکم دیا کہ لاش کو نہایت حفاظت سے آگرہ پہنچا کر تاج محل کی عمارت کے جلو خانہ سے متصل تیس ہزار روپیہ کی لاگت سے مقبرہ تیار کیا جائے جسے آج عام لوگ سہیلیوں کے مقبرے

سے بکارنے میں اور آئندہ اخراجات کے لئے ایک گاؤں کی آمدنی وقف کر دی۔ یہ محض مرحوم کی ہنروری کی وجہ سے ہوا۔ جس سے شاہجہاں بہت متاثر تھا۔

غرضیکہ اسی طرح بے شمار مثالیں مغل شہنشاہوں کے دربار کی علمی و فنی فیاضیوں کی ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ ان سلاطین کی ہنر پروری سے کس قدر ان علوم و فنون کو فروغ ہوا جس کی مثال آج دنیا میں نہیں ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر

شاہجہاں کی زندگی ہی میں اس کا لڑکا اورنگ زیب عالمگیر اپنے آپ کو تاج و تخت کا زیادہ اہل ثابت کر کے تخت نشین ہوا۔ اور سیاست ملک کا رنگ اور ہو گیا۔ مذہبی فضا زیادہ نظر آنے لگی، فنون لطیفہ کے ماہرین کی سرپرستی جو ہمیشہ دربار سے وابستہ رہی تھی، اس میں بعض حالتوں میں کچھ فرق آگیا۔ یعنی ماہرین موسیقی و مصوری کو اپنا میلان و رجحان بدلنا پڑا۔ بعض کو مرکز سے ہجرت کر کے اور سرپرست تلاش کرنے پڑے۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ ابھی تک حکمران سے ادراک فن مفقود نہیں ہوا تھا۔ محض ماحول کی مجبوریوں کی وجہ سے ایسا ہوا۔ کیونکہ جب اورنگ زیب کی بیوی رابعہ دُرانی دلرس بانو بیگم کا اورنگ آباد میں انتقال ہوا تو اورنگ زیب کے فرمان سے اس کے لڑکے نے اپنی والدہ ماجدہ کا مقبرہ تاج محل آگرہ کے انداز میں عطا اللہ معمار کی ہدایت سے تعمیر کیا۔ لاہور میں جب بادشاہی مسجد کی تعمیر زیر نگرانی فدائی خاں کوکہ ہوئی تو یہ مسجد عالم بھر میں فن تعمیر کی تاریخ میں اپنی آپ نظیر ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ مسجد کی حد تک یہ مسجد دنیا بھر کی مساجد سے وسیع ہے۔ خاص کر یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ حرم مکہ کی وسعت بھی اتنی ہی ہے۔ یہ اطلاع راقم کو حال ہی میں ایک ثقہ حاجی حرمین شریفین سے ملی۔ غرضیکہ وقت کے اعتبار سے ہنروری، ہنر پروری، ہنر شناسی، اور ہنر افزائی میں تبدیلی کی وجہ سے معیار فن میں بھی خاصہ اثر ہوا۔ جو اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس دور کے بعد جو کچھ

تعمیر ہُوا یا مصوّری ہوئی وہ زیادہ تر انحطاط کی طرف مائل ہے۔ غرضیکہ یہ دور فنونِ لطیفہ سے غفلت کا زمانہ اگر کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔

مآثرِ عالمگیری میں باقاعدہ نقاش خانہ کا ذکر بھی ملتا ہے جس کے لئے میر عبد الکریم کو داروغہ نقاش خانہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اورنگ زیب نے مصوّری سے سیاسی طور پر بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ اس نے اپنے لڑکے محمد سلطان کی تصویر طلب کی جسے اس نے قلعہ گوالیار میں زیر حراست رکھا ہوا تھا۔ البتہ موسیقی کے لئے مآثرِ عالمگیری میں یوں ملتا ہے کہ دربارِ شاہی میں نغمہ و سرود کے کل استاد ہر وقت موجود رہتے تھے۔ اور باکمال سازندے اور اہل نشاط کا ایک گروہ دربار میں ہر وقت حاضر رہتا تھا۔ لیکن قبلہ عالم اس طرف بہت کم توجہ فرماتے۔ ابتدائے عہد معدلت میں تو کبھی کبھی نغمہ و سرود سن بھی لیتے تھے لیکن آخر عمر میں اس سے بھی تائب ہوگئے۔ ارباب نشاط کے گروہ میں سے جو شخص پیشہ سرود سے توبہ کر لیتا حضرت اسے معاش کے طور کچھ جاگیر عطا فرماتے۔ مرزا مکرم صفوی موسیقی کا بہترین ماہر تھا۔ قبلہ عالم سے سوال کیا کہ نغمہ و سرود کی بابت حضرت کی کیا رائے ہے۔ قبلہ عالم نے فرمایا کہ جو اس کے اہل ہے اس کے لئے حلال ہے —— الخ۔

اورنگ زیب کے عہد کی مصوّری کے ضمن میں یہ بیان کرنا لازمی نظر آتا ہے کہ حسن اتفاق سے انڈیا آفس لائبریری لندن میں ایک تصویر نواب اسد خاں وزیرِ اعلیٰ اورنگ زیب کی موجود ہے۔ جس کا اصل نام محمد ابراہیم تھا۔ اور یہ نواب صادق خاں میر بخشی کا پوتا اور نواب جعفر خاں کا لڑکا تھا اور خود نواب جعفر خاں ابتدائے عہد میں اورنگ زیب کا وزیر تھا۔ جو شاہجہاں کے نہایت معتمد علیہ اور مقبول امرا میں سے تھا۔ وہ خانساماں تھا اور اسے اسد خاں کا لقب تھا۔ اورنگ زیب کو شاہجہاں نے اس کی اتالیقی میں دیا تھا اور یہ ترقی کرتے ہوئے اورنگ زیب کے عہد کے آخری ۲۷ سال میں تا وفات بادشاہ وزیرِ اعظم رہا۔ اسے ۳۱ جلوس عہد اورنگ زیب میں امیر الامراء کا خطاب عطا ہُوا۔ اور اسے خنجر و قبضہ لگانے کا حکم ہُوا۔ بلکہ اورنگ زیب کے بعد اس کے لڑکے بہادر شاہ کا بھی قریب ۵ سال تک وزیرِ کل رہا۔ آخر ضعیف العمری

مآثرِ عالمگیری ۵۳۲-۵۳۱ (اردو ترجمہ) مطبوعہ دار الترجمہ حیدر آباد دکن۔

کے باعث خدمت سے سبکدوش ہوگیا مگر اس کا لڑکا ذوالفقار خاں اس کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اور اس کا انتقال ۱۱۲۶ھ میں نوّے سال کی عمر میں ہوا۔ انڈیا آفس لنڈن میں اس عظیم الشان اہم شخصیت کی ایک تصویر حسن اتفاق سے جانسن مجموعہ میں موجود ہے جسے ڈاکٹر لارنس بینین اور سر ٹامس آرنلڈ نے اپنی تالیف کورٹ پینٹرز آف دی گرینڈ مغلز میں اصل رنگوں میں اور قریب اصل سائز میں ۱۹۲۱ء میں طبع کرایا ہے۔ مگر راقم نے اس اصل کا کئی بار مطالعہ بھی کیا ہے۔ کیونکہ انڈیا آفس لائبریری میں اسے ایک فریم میں لگا کر لٹکایا ہوا ہے۔ اس تصویر کا ایک مشاہدہ واضح کرتا ہے کہ مصوّر نے جس کا اگرچہ اس پر نام نہیں ہے حسب دستور اسے نیم چہرہ والی تصویر بنا کر نواب اسد خاں کو غیر فانی کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں بہترین شبیہہ کا ثبوت دیا ہے سب سے بڑھ کر اس عہد میں امراء کے لباس اور درباری ضوابط کا وقار واضح ہے۔ غالباً یہ تصویر ۴۵ سن جلوس عہد اورنگ زیب میں بنائی جبکہ نواب موصوف کو امیر الامرا کا خطاب عطا ہوا۔ اور ساتھ ہی آپ کو خنجر و قبضہ پہننے کی اجازت ہوئی جو اس تصویر سے عیاں ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ باوجود اس عہد میں فنون کا انحطاط ہو چکا تھا مگر یہ تصویر اس دعویٰ کی تردید کرتی ہے یعنی فہم فن ابھی باقی تھا جو ہمیشہ رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ تصویر اس عہد میں ایک زندہ مثال ہے۔

افسوس اس امر کا ہے کہ اورنگ زیب کے عہد سے متعلق غیر مسلم لکھنے والوں نے عموماً بغیر مطالعہ کئے اور بغیر سوچے سمجھے تعصب کے رنگ میں اورنگ زیب کے خلاف بہت لکھ دیا ہے۔ مگر ہمیں باور کرنا پڑیگا کہ بعض واقعات دربار کی کسی سیاسی پالیسی کے اعتبار سے اگر کسی خاص امر کی طرف کماحقہٗ توجہ نہیں ہوئی تو یہ ہرگز تصوّر نہیں کرنا چاہئے کہ اب اس فن یا شعبہ کا فقدان ہو چکا ہے یا کامل ادراک کالعدم ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس دور کے مغل مصوّروں نے نئے نئے سرپرست پہاڑی ریاستوں میں تلاش کئے اور اسی مغل دبستان مصوّری نے اپنے نئے ماحول کے اعتبار سے خالص ہندوانی تصاویر میں روپ لے لیا۔ کوئی اسے آج راجپوت سکول کہتا ہے، کوئی کانگڑہ قلم کہتا ہے۔ کوئی پہاڑی قلم کہتا ہے۔ مگر دراصل یہ تمام جدوجہد اسی مغل دبستان کا سلسلہ ہے۔ ہاں اس میں ان مذہبی مصوّرین نے زیادہ تر رادھا اور کرشن و رام لیلا موضوعات کو دخل دیا ہے۔ داراشکوہ کے لڑکے شہزادہ سلیمان شکوہ کے ہمراہ ایک مصوّر خاندان

بھی گڑھوال میں راجہ فتح سنگھ کے ہاں پناہ لی تھی مگر شہزادہ تو وہاں سے آگیا اور یہ خاندان مصورین جو کھیرداس اور شام داس مصوّرین پر مشتمل تھا وہیں رہا۔ یہ لوگ فارسی کے عالم فاضل تھے ان کا ایک نوجوان لڑکا مولارام تھا جو صوفیانہ طبیعت رکھتا تھا۔ اس نے مصوّری میں بہت کمال پیدا کیا۔ غرضیکہ ہندو مصوّری جو کئی ناموں سے آج ملتی ہے وہ اسی مولارام کی ہنروری اور گڑھوال کے راجاؤں کی ہنر شناسی کا نتیجہ ہے یوں کہنا چاہیئے کہ آج تک مصوّر خاندان جو پہاڑوں میں کام کرتے ہیں۔ اور ہندو اُن پر بہت نازاں ہیں وہ سب مغل دربار کے ہنرمندانہ ماحول کی بازگشت ہے۔ راقم نے ایک مفصل اور مستقل کتاب بعنوان "فنون لطیفہ بعہد اورنگ زیب عالمگیر" لکھی ہے جس میں یہ سب امور بالاستیعاب بیان کئے گئے ہیں۔

اسی طرح اگر خطاطی کی طرف ہم توجہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اورنگ زیب نے خود قرآن لکھے تھے۔ اور ان کو مکّہ معظمہ و مدینہ منوّرہ بھجوا دیا تھا۔ اور ان پر نام تک نہیں لکھے[1]۔ غرضیکہ فن من حیث الفن کا ادراک اورنگ زیب کو بدرجہ اتم تھا جو متذکرہ بالا فن تعمیر، مصوّری، موسیقی و خطاطی کے بیان سے واضح ہے۔ مگر سیاسی طور پر ماحول بدل چکا تھا۔

خاتمہ

۱۱۱۸ھ (۱۷۰۷ء) تک ہنروری، ہنر شناسی اور علم پروری اور علم افزائی کی ایک سرسری کیفیت عہد اسلامی میں بیان کرنے کے بعد جب ہم آج موجودہ ماحول پر نظر ڈالتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ دنیا ہی تبدیل ہو چکی ہے۔ اور متذکرہ بالا اپنے شاندار ماضی سے اس کا مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ عبرت و حسرت کے سوا اور کچھ نہیں۔ رب العالمین سے دعا ہے کہ وہ پھر اس ملک میں علم و فن کی فراوانی کا دور دورہ کر دے۔

---

[1] اسلامک کلچر۔ "حقیقت اسلام" اپریل ۱۹۵۰ء۔ مفصل مضمون راقم بعنوان "شہنشاہ اورنگ زیب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن کریم۔"

"مطبوعہ الفنشاپریس لاہور"